بلھے شاہ

سُریندر سِنگھ کوہلی

ہندستانی ادب کے معمار

*

کتاب کے آخری صفحہ پر دی گئی سنگتراشی کی تصویر پر ایک منظر پیش کیا گیا ہے جسمیں بادشاہ سدھوڈانا سے تین جیوتشی مہاتما بدھ کی ماں، ملکہ مایا کے خواب کی تعبیر بیان کر رہے ہیں۔ ان کے نیچے ایک محرر اس تعبیر کو قلمبند کر رہا ہے۔ شاید ہندوستان میں فن تحریر کا یہ سب سے قدیم با تصویر دستیاب شدہ ریکارڈ ہے۔

از ۔ نگرجونا کونڈا ۔ دوسری صدی عیسوی

ازراہِ عنایت : نیشنل میوزیم ، نئی دہلی

ہندوستانی ادب کے معمار

بُلھے شاہ

سُرِندر سنگھ کوہلی

ترجمہ

کامل قریشی

ساہتیہ اکیڈمی

Bulhe Shah : Urdu translation by Kamil Quraishi of Surinder Singh Kohli's monograph in English. Sahitya Akademi, New Delhi (1992), Rs. 15 .

پہلا ایڈیشن : ۱۹۹۲ء

ساہتیہ اکادمی

ہیڈ آفس :

رویندر بھون، ۳۵۔ فیروز شاہ روڈ۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

سیلس آفس : 'سواتی' مندر مارگ۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

علاقائی دفاتر :

جیون تارا بلڈنگ۔ چوتھی منزل، ۲۳ اے/۴۴ ایکس۔ ڈائمنڈ ہاربر روڈ، کلکتہ ۷۰۰۰۵۳

۱۷۲، ممبئی مراٹھی گرنتھ سنگھرالیہ مارگ، دادر، ممبئی ۴۰۰۰۱۴

۳۰۴۔ ۳۰۵۔ اناسلائی، تینام پیٹھ۔ مدراس ۶۰۰۰۱۸

۱۰۹۔ جے۔ سی روڈ۔ بنگلور ۵۶۰۰۰۲

قیمت :۔ پندرہ روپئے

I S B N 81-7201-372-8

اے ذن آفسٹ پرنٹرس۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

فہرست

بُلھے شاہ۔ ایک صوفی
اُن کا ورثہ اور زندگی کے حالات

تصوّف کا ایک مختصر جائزہ

اسلامی صوفیانہ نظریے کو اصطلاحی معنوں میں تصوّف کہا جاتا ہے۔ لفظ صوفی کا تعلق عربی لفظ صفا سے ہے جس کے معنی خالص کے ہیں لفظ 'صف' کا مطلب سلسلہ، مرتبہ یا مقام و ترتیب ہے اور صوف سے مراد اُون ہے۔ قدیم اسلامی دور میں وہ مسلمان درویش جو اونی لباس پہنا کرتے اور بہت سادہ زندگی گزارتے، صوفی کہے جاتے تھے۔ وہ قرآن و حدیث کے مطالعے میں مشغول رہتے، زہد و تقویٰ، پاکیزگی اختیار کرتے اور قناعت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ لفظ صوفی، دوسری صدی ہجری کے آخر میں مستعمل ہونا شروع ہوا۔

تصوّف کی اصل کا سلسلہ خود پیغمبر اسلامؐ کی ذات سے ملتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا علم سفینہ، قرآن کے ذریعہ پہنچا ہوا علم ہے اور علمِ سینہ دل کے ذریعہ ملا ہوا علم ہے۔ جس کی ترجمانی صوفیوں نے کی ہے۔ قرآن کی کچھ آیات میں تصوّف کی تخم ریزی نظر آتی ہے۔ پیغمبر اسلامؐ اور اُن کے صحابۂ کرام نے اپنی زندگیوں میں جو خدمات انجام دی ہیں اُنھوں نے قدیم صوفیوں کے ایک آدرش کا کام کیا۔ دنیاوی لہو و لعب سے بچنا اور رہبانیت کو اختیار کرنا تصوّف کی قدیم ترین صورت تھی۔ اللہ کا شدید خوف اور اس کے سزا و جزا کا فیصلہ دلوں میں موجود تھا۔ قدیم صوفیا بہت نیک لوگ تھے۔ جو مجاہدہ، توکل اور تسلیم و رضا کے اصولوں پر ہمیشہ ثابت قدم رہنے والے تھے۔

۸ ویں صدی عیسوی کے اختتام تک تصوف میں ایک نیا ارتقاء رونما ہونا شروع ہوا یونانی، ایرانی، ویدانتی، اور یورپی اثرات یہ تبدیلی لانے کا سبب بنے جوگی اور درویش عارف باللہ ہوگیا۔ بھگتی، عرفانِ الٰہی کے زیرِ اثر تھی۔ تقلید پرست اور کٹر مسلمانوں نے ایسے صوفیوں کو بدعتی، رافضی، اور مذہبی عقائد کا مخالف قرار دیا۔

پھر اس کے بعد ۱۳ ویں صدی عیسوی میں تصوف کا شاندار دور آیا جس میں ایران کے تین صوفی شاعر فریدالدین عطار، جلال الدین رومی اور شیخ سعدی پیدا ہوئے۔ دوسرے مشہور صوفی شعراء میں چودھویں صدی اور پندرہویں صدی عیسوی میں حافظ اور جامی نے ترتیب وار شہرت پائی۔

خدا کی تحقیق و تفکر میں ڈوبے رہنے والے اور عرفان ربانی کے دلدادہ صوفیوں کو تین روحانی حلقہ ہائے خیال میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ۱۔ ایجادیہ ۲۔ شہودیہ ۳۔ وجودیہ۔
پہلا مکتب خیال کہتا ہے کہ خدا دنیا کو عدم سے وجود میں لایا ہے۔ دوسرے مکتب خیال کا نظریہ ہے کہ دنیا ایک آئینہ کی مانند ہے جس میں الٰہیہ صفات منعکس ہوتی ہیں۔ تیسرا مکتب خیال وحدانیت کا قائل ہونے کے سبب دعویدار ہے کہ دنیا کی ہر شے میں خدا ہے۔ خدا کے متلاشی کی منزل مقصود خدا سے اتصال ہے۔ وہ راستہ جو خدا کی طرف جاتا ہے۔ متعدد منزلوں سے گزرتا ہے۔ جس میں عبودیت، عشق، زہد، معرفت، وجد، حقیقت اور وصل شامل ہیں۔ روح کی ترقی تدریجی ہے اور اس کی نشاندہی چار صورتوں میں ہوتی ہے۔ یعنی ناسوت، شریعت ملکوت، جبروت اور لاہوت۔ پہلی صورت میں طالب شریعت کا مشاہدہ کرتا ہے دوسری شکل میں روحانی سفر یعنی طریقت کی منزل سے گزرتا ہے۔ تیسری حالت میں معرفت حاصل کرتا ہے۔ اور چوتھی منزل میں وہ اصلیت اور صداقت یعنی حقیقت کو جا پہنچتا ہے۔

تمام روحانی سفر میں طالب کی رہنمائی اس کے پیرو مرشد کے ذریعہ ہوتی ہے اس روحانی سفر کے درمیان عبادت کے جو اشغال ہوتے ہیں۔ ان میں نماز، تلاوتِ قرآن، اوراد، مجاہدہ، ذکر اور مراقبہ شامل ہیں

ہندوستان میں تصوّف کا آغاز

مسلمانوں کی فتوحات کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں صوفیائے کرام کثیر تعداد میں آ گئے ان کا بڑا مقصد اسلام کی تبلیغ و اشاعت تھا۔ اس طرح انھوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کی طاقت کو مضبوط سے مضبوط تر کیا۔ بلاشبہ شروع میں تبدیلیٔ مذہب کا کام تلوار کے زیر اثر ہوا۔ لیکن زیادہ تر لوگ حضرت فریدالدین گنج شکر اور حضرت علی ہجویری داتا گنج بخش جیسے بزرگ صوفیوں کی تعلیمات اور وعظ و نصیحت کی وجہ سے داخل اسلام ہوئے تاہم بعد کے صوفیوں نے ہندوستان کے مختلف مذاہب اور فلسفوں کے مطالعے کے لیے خود کو وقف کر دیا۔

ہندوستان میں پہلے پہل مسلمان جہاں آباد ہوئے وہ علاقہ ساحل مالابار تھا۔ جو مسلم صوفیوں کے زیر اثر آیا۔ حالانکہ محمد بن قاسم ۷۱۲ء میں سندھ پر حملہ آور ہوا تھا مگر وہاں کوئی مسلم آبادی قائم نہیں ہوئی تھی لیکن درۂ خیبر کے راستے ترک، منگول اور افغان فوجی، اور دوسرے مسلمان فقیر اور درویش ہندوستان میں داخل ہوئے۔ ہندوستانی تفکر یعنی تصورِ حیات مسلم فتوحات سے بہت پہلے صوفی تصورات پر اثرات مرتب کر چکا تھا۔ لیکن یہ صرف ہندوستان میں مسلمانوں کے قیامِ حکومت کے بعد رونما ہوا کہ اسلام نے ہندو تصورِ حیات کو زبردست متاثر کیا۔

جو صوفیائے کرام ہندوستان آ کر آباد ہوئے ان کا تعلق تصوّف کے چار بڑے سلسلوں سے تھا۔ ان میں چشتیہ، قادریہ، سہروردیہ، اور نقشبندیہ سلسلے شامل ہیں۔ ان چار سلسلوں میں سے ہندوستان میں سب سے پہلے چشتیہ سلسلے کا قیام عمل میں آیا۔ ان سلسلوں نے پنجاب میں جو ہندوستان میں داخل ہونے کے لیے ایک دروازہ کی حیثیت رکھتا تھا اپنا زبردست کردار ادا کیا تھا۔

ان چار صوفی سلسلوں کے علاوہ فردوسی اور شطاری دو اہم سلسلے اور تھے۔ ویسے تو یہ سب سلسلے ممتاز مانے جاتے تھے لیکن مریدوں کا کئی کئی سلسلوں سے بیک وقت وابستہ رہ کر پیروں سے رشد و ہدایت لینے کا عمل عام ہو گیا تھا۔ پھر بھی ایک ہی وقت

میں ایک سے زیادہ سلسلوں میں روحانی عقیدت رکھتے تھے۔ ایسی صورت میں مرید بھی ان کا مقاندرہ کر مشہور ہوتا تھا جیسے کہ بُلھے شاہ اور ان کے پیر شاہ عنایت کے ساتھ ہوا کہ وہ قادری اور شطاری صوفیوں کے سلسلے سے منسوب ہو کر مشہور ہوئے۔ ۱۷ویں صدی عیسوی کے آخر تک ہندوستانی تصوّف میں ایک قابلِ لحاظ تغیّر رونما ہوا۔ اورنگزیب کل برصغیر ہند کو اسلام کا پیرو بنا دینا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے نہایت سخت اور بے رحمانہ طریقے اختیار کیے۔ بنیادی صوفیوں نے اس اسلامی کٹّریت کے اقدام کو پسند نہیں کیا اور باہمی رواداری اور مذہبی عقائد کی آزادی کے لیے آواز بلند کی۔ پھر وہ زیادہ دن تک اسلام کے مبلّغ نہ رہے اور دوسرے مذاہب کے طور طریق اور اصولوں کے مطالعہ کی طرف رجوع ہوتے گئے۔ اس ضمن میں شہزادہ دارا شکوہ کے ہندو ویدانتی فلسفے کا ہم کو بخوبی علم ہے۔

پانچ دریاؤں کی سرزمین پنجاب، حقیقت میں اسلام کا گڑھ بن چکا تھا۔ صوفیوں کے بڑے سلسلے شمالی ہندوستان کے اس حصّے میں مضبوط بنیاد کے حامل تھے۔ ان میں روحانیت کے علمبرداروں کی اکثریت، ویدانتی تصور اور ہندو بھگتی تحریک کے زیرِ اثر تھی۔ مسلۂ تناسخ، پُنر جنم اور کرم کے عقیدوں نے بھی ان پر بہت گہرا اثر کیا تھا۔ اللہ ہی ان کے نزدیک اصل حقیقت اور باقی سب کچھ وہم اور دھوکا تھا۔ تصوّف میں نئے تغیرات کے سبب پنجابی صوفیوں کو دو بڑے مکاتیب خیال میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے کو تقلید پسند مکتبِ خیال کے قرآن پر عمل کرنے والے صوفیار کا نام دیا جا سکتا ہے۔ دوسرے کو فلسفیانہ مکتبِ خیال یا وحدتُ الوجود (ہمہ اوست) کے تصوّف کا مکتب کہا جا سکتا ہے۔ بُلھے شاہ بعد کے مکتبِ خیال کے نمائندہ تھے۔

حیاتِ بُلھے شاہ

بُلھے شاہ کی زندگی کے حالات کہیں نہیں ملتے، فارسی نثر کی ایک کتاب "خزینۃ الاصفیار" میں جسے ۱۲۸۱ھ میں مفتی غلام سرور لاہوری نے مکمل کیا اور جو ۱۲۸۴ھ میں شائع کی گئی۔ ان کے بارے میں ریکارڈ ملتا ہے۔ اس کتاب کے ذریعہ مشہور مسلم صوفیار کرام سے متعلق بیش قیمت معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ بُلھے شاہ کے بارے میں معلومات

مندرجہ ذیل ہیں:

"میر بلھے شاہ قادری شطاری قصوری حضرت شاہ عنایت لاہوری کے مشہور و معروف مریدوں میں سے ایک مرید تھے۔ وہ قصور کے شہر میں رہتے تھے۔ ان کے پیروں کا سلسلہ شاہ محمد غوث گوالیاری تک پہنچتا ہے۔ بلھے شاہ عبادت و ریاضت، زہد و تقویٰ، مستعدی و گرم طبعی، دلکشی دلآویزی اور نشۂ الٰہیہ سے بھرپور شخصیت کے مالک تھے انھوں نے وحدانیت (وحدت) کے بارے میں نہایت پاکیزہ اور اعلیٰ خیالات کا اظہار کیا ہے۔ عام لوگ وحدانیت اور علم روحانی سے متعلق ان کے اشعار بڑی عقیدت سے پڑھتے ہیں۔ صوفیوں کی محفلوں میں قوال ان کی کافیاں گاتے ہیں۔ اور سامعین کے جذبات میں گرمی و تیزی پیدا کرتے ہیں۔ لوگ میر صاحب کے بہت سے معجزے بیان کرتے ہیں۔ ان کی وفات ۱۱۷۱ھ میں ہوئی۔"

بلھے شاہ کے سلسلہ میں اہم معلومات کا دوسرا اہم ذریعہ مولوی محمد دین شاہ پوری کی تحریر کردہ کتاب پنجابی شاعری میں "باغ اولیائے ہند" ہے اس کتاب میں بلھے شاہ سے متعلق مندرجہ ذیل معلومات فراہم ہوتی ہیں:-

"یہ مقدس ہستی (بلھے شاہ) پٹھانوں کے شہر قصور میں ہوئے انھوں نے فیض روحانی شاہ عنایت سے حاصل کیا۔ جن کا شجرۂ نسب ایک طرف پیر جیلانی جن کا مقبرہ لاہور کے جنوبی حصے میں واقع ہے سے ملتا ہے اور بہت دور تک جاکر رسول خدا سے ملتا ہے۔ بلھے شاہ نے اپنے پیر و مرشد کے انتخاب کے لیے کچھ اس طرح تلاش شروع کی کہ جس سے قلب مطمئن ہو سکے۔ بلھے شاہ اپنی روح کی آواز پر مرشد کی جستجو کے لیے نکلے تو انھوں نے سب سے پہلے لاہور شہر کو چھاننا شروع کیا جہاں وہ شاہ عنایت کے باغ میں جاکر ٹھہرے اور ایک درخت پر لگا ہوا آم دیکھا۔ اسے دیکھ کر انھوں نے خدا کا نام لیا اور فوراً ہی آم ٹوٹ کر گر پڑا۔ شاہ عنایت نے انہیں پکارا اور کہا۔ سنو اے مسافر! یہ آم واپس

کرو جو تم نے چرایا ہے۔ بُلّھے شاہ نے جواب دیا۔ میں درخت پر نہیں چڑھا۔ ہوا کی وجہ سے یہ آم ٹوٹ کر میری گود میں آگرا۔ لیکن باغ کے مالک نے کہا۔ تم نے خدا کا نام لیا اور آم آگرا۔ اس طرح تم چوری کے عمل کے مرتکب ہوئے بُلّھے شاہ پر حقیقت واضح ہوگئی کہ شاہ عنایت کو روحانی طاقت حاصل ہے۔ چنانچہ یہ فقیر اُن کے قدموں میں گر گیا اور قدم بوسی کی، اس طرح بُلّھے شاہ، شاہ عنایت کے مرید ہوگئے اور اُن پر بہت سے روحانی اسرار منکشف ہوئے۔ ۱۱۷۱ھ میں وہ وفات پا گئے۔ ان کی یادگار کے طور پر ایک عظیم الشان مقبرہ تعمیر کیا گیا۔"

مولوی شاہ پوری کی مندرجہ بالا کتاب میں جس سے بُلھے شاہ کے حالات زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔ مختلف دوسرے فقیروں اور درویشوں کے بارے میں بھی مختصر تذکرہ ملتا ہے۔ یہ لاہور سے ۱۹۲۸ء میں شائع کی گئی تھی۔

مذکورہ بالا کتاب کی طرح ایک دوسری کتاب بُلھے شاہ کے بارے میں ایک حکایت بیان کرتی ہے۔ اس کا نام "قانونِ عشق" ہے۔ انور علی شاہ روہتکی کا یہ کارنامہ دو حصوں پر مشتمل لاہور سے شائع ہوا۔ اس کے پہلے حصے میں بُلھے شاہ سے متعلق مندرجہ ذیل روایت ملتی ہے۔

"طالب صادق بُلھے کے دل میں خدا کے رسول کے عشق کی آگ دوگونہ طور پر روشن تھی۔ وہ مقدس مدینہ کو اُڑ کر حضورؐ کے روضۂ انور کی زیارت کرنا چاہتا تھا۔ جب وہ بہت بے چین اور متفکر ہوا تو اس نے اپنی ذہنی حالت مُرشد سے بیان کی، مُرشد نے کہا تو وہاں کیوں جانا چاہتا ہے۔ مرید نے جواب دیا! رسول خدا کے روضۂ منوّر کے نظارے کا جذبۂ عشق مجھے کھینچ رہا ہے۔ کیوں۔؟ مرشد نے پوچھا۔ اس لیے کہ خدا کے رسول نے خود ارشاد فرمایا ہے کہ جو شخص میرے روضے کی زیارت کرتا ہے وہ بذاتِ خود مجھ سے ملتا ہے۔ مرید نے جواب دیا۔ جب مرشد نے یہ سنا تو کہا۔" میں تجھ کو تین روز کے بعد جواب دوں گا۔" بُلھے نے بتایا کہ تیسری رات کو اس نے رسولِ خدا کو ذاتی طور پر تشریف لاتے ہوئے خواب میں دیکھا۔

بلھا رسولِ خدا کے قدوم مبارک پر سر بسجود ہوا، رسولِ خدا نے ارشاد فرمایا۔ "اپنے مرشد کو پکار۔ رسولؐ کی موجودگی میں مرشد کو آواز دی گئی۔ حضور نے مرشد بلھے کو اپنے دائیں طرف بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ بلھے ان کے سامنے حیرت واستعجاب کے ساتھ کھڑا رہا۔ جب اس نے اپنی آنکھیں اٹھائیں تو اپنے سامنے خدا کے رسول اور اپنے مرشد کو پایا۔ وہ ان کی شکلوں میں کوئی فرق نہ کرسکا۔ سخت حیرت اور خوف کی وجہ سے بلھے جاگ اٹھا۔"

مندرجہ بالا روایت کو ہی ایف اسبورن نے بھی بلھے شاہ نامی اپنے کتابچے میں نقل کیا ہے۔ بلھے شاہ سے متعلق ادھر اُدھر سے اور سینہ بسینہ کئی اور داستانیں بھی بکھری ہوئی اور زبان زد مل جاتی ہیں۔ شاعروں اور قوالوں کی زبانوں پر بھی بہت سی کہانیاں موجود ہیں۔ ایک بات ان روایات سے صاف جھلکتی ہے کہ شاہ عنایت قادری شطاری بلھے شاہ کے مرشد تھے۔

شاہ عنایت قادری شطاری۔ بلھے شاہ کے مرشد

دستیاب شدہ ذرائع کے مطابق شاہ عنایت کے بارے میں بیان سے پہلے قادری شطاری سلسلے کے ضمن میں ایک مختصر سا ذکر ضروری ہے۔

یہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ قادری سلسلہ تصوف کے چار بڑے سلسلوں میں سے ایک ہے۔ اس کے بانی شیخ عبدالقادر جیلانیؒ تھے۔ اس کی دو شاخیں ہیں ایک حسین شاہی اور دوسری میاں خیل، شطاری سلسلہ طیفوسی خانوادے کی شاخ ہے جس کی بنیاد بایزید بسطامی نے رکھی تھی۔ اس کے بانی شیخ عبداللہ شطاری تھے جو شیخ شہاب الدین سہروردی کے جانشین تھے۔ بعض صوفیانہ اعمال کی وجہ سے شطاریوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ مختصر سے وقت میں فنا اور بقا کی منزلوں کو حاصل کر لیتے ہیں۔ ایسے اعمال کی تکمیل پر عبداللہ شطاری پہلے شخص تھے جنھوں نے شطاری خطاب پایا تھا۔ ان کے پیر شیخ محمد عارف نے انہیں ہندوستان بھیجا تھا۔ شاہ محمد غوث گوالیاری عبداللہ شطاری کے بعد اس سلسلے کے چوتھے بزرگ تھے۔ وہ بہت سی کتابوں کے مصنّف تھے

۱۷۶۲-۶۳ء میں اُنھوں نے وفات پائی اور گوالیار میں دفن کیے گئے۔

بلھے شاہ کے مرشد شاہ عنایت اگرچہ ایک قادری صوفی تھے۔ لیکن ان کو شطاری درویش حضرت رضا شاہ شطاری نے صوفیانہ عظمتوں سے روشناس کیا تھا چنانچہ وہ قادری شطاری کے طور پر مشہور ہوئے ان کے مرید بُلھے شاہ بھی قادری شطاری کہلائے۔

"خزینۃ الاصفیاء" اور "باغِ اولیائے ہند" کے مطابق شاہ عنایت لاہور کے باشندے ہونے کی وجہ سے لاہوری کہلائے۔ اپنے عقیدے کی تبلیغ کے لیے کچھ وقت قصور میں بھی رہے۔ جہاں اُنھوں نے ایک بیسوا کی لڑکی سے شادی کی جس کے رشتہ داروں نے اس پر احتجاج اور چیخ وپکار کرتے ہوئے نواب حسین خاں پٹھان حاکم کے سامنے ایک درخواست پیش کی۔ جب نواب نے صوفی عنایت سے اس سلسلہ میں پوچھ گچھ کی تو وہ خفا ہوگئے اور اُلٹے حاکم سے اس کے سوال کی معقولیت پر سوال کر ڈالے اور حاکم کے مخالفانہ رویّے کی بناء پر اپنے اہل وعیال کے ساتھ قصور کو خیرباد کہتے ہوئے حاکم کے لیے خدا سے بد دعا کی جو کچھ عرصہ بعد مارا گیا۔ شاہ عنایت کا انتقال ۱۷۲۸ء میں ہوا اور وہ لاہور میں دفن کیے گئے۔

شاہ عنایت ایک باغبان (ارائیں) تھے۔ ایک زبانی روایت مشہور ہے کہ ایک روز وہ اپنے باغ میں کام کر رہے تھے کہ ایک حقیقی روحانی مُرشد کی تلاش کرتے ہوئے بُلھے شاہ وہاں آئے۔ بُلھے شاہ نے شاہ عنایت کی روحانی عظمت کے بارے میں سن رکھا تھا۔ صوفی عنایت نے بُلھے شاہ کے آنے کی وجہ دریافت کی۔ بُلھے شاہ نے ان سے التجا کی کہ وہ مسئلہ اسرار خدا کی تعلیم دینے کے لیے انہیں اپنا مرید بنالیں کہا جاتا ہے کہ اس سلسلے میں جواباً صوفی عنایت نے مندرجہ ذیل دوہا پڑھا ؎

بُلھیا رَبّ دا کی پاؤنا
ادھروں پٹنا تے اُدھر لاؤنا

ترجمہ: او بُلھے خدا کی پہچان کا راز یہ ہے
کہ ایک طرف سے اُکھاڑ کر دوسری طرف پودا لگا دینا۔

کہا جاتا ہے کہ بُلھے شاہ اس جواب کو سن کر بہت متاثر ہوئے اور صوفی عنایت سے بیعت ہوگئے۔ ایک روایت بُلھے شاہ کی اپنے مُرشد سے ملنے کی اس

باب کے آغاز میں بیان کی گئی ہے۔ بُلّھے شاہ نے اپنے مرشد کا نام اپنی کچھ کافیوں میں لیا ہے۔ مثلاً:۔

بُلّھے شاہ دی سنو حکایت
ہادی پکڑیاں ہوگ ہدایت
میرا مرشد شاہ عنایت
اوہ لنگھائے پار

بُلّھے شاہ کی حکایت سنو
اُس نے اپنے مرشد کا دامن تھام لیا ہے
شاہ عنایت میرا مرشد ہے
وہی میرا بیڑہ پار لگائے گا۔

عنایت سب ہوایا تن ہے
پھر بُلھا نام دھرایا ہے
ترجمہ: میرے جسم نے عنایت کا روپ دھار لیا ہے
تب اس کا نام بُلھا پڑا ہے۔

بُلھا شاہ دی ذات نہ کائی
میں شاہ عنایت پایا ہے
ترجمہ: بلھا! محبوب کی کوئی ذات نہیں
مجھے میرا محبوب عنایت میں مل گیا ہے۔

بُلھا، شاہ سنگ پریت لگائی
جی جامے دی دِتّی سائی
مرشد شاہ عنایت سائیں
جس دل بر مایو رے

ترجمہ: بُلھے نے اپنے محبوب سے لو لگائی ہے۔
اور اس نے خود کو اُس کے حوالے کر دیا ہے
میرا مرشد شاہ عنایت ہے
جس نے میرا دل جیت لیا ہے

بُلھیا ڈھیہہ پو عنایت دے بُوہے
جس پہنائے تینوں ساوے تے سُوہے
ترجمہ او بلھیا! جُھک جا عنایت کے در پر
جس نے تجھ کو مختلف رنگوں کے لباس میں ملبوس کر دیا ہے

ماپے چھوڑ لگی لڑ تیرے
شاہ عنایت سائیں میرے
لائیاں دی لاج پال وے، ویہڑے آوڑ میرے
میں تیرے قربان وے ویہڑے آوڑ میرے
ترجمہ: او میرے آقا شاہ عنایت
میں نے اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر
ترے ہاں پناہ لی ہے تو میری محبت
کا جواب دے تو میرے صحن دل میں آجا
میں تیرے قربان تو میرے صحن دل میں آجا

بُلھے شاہ کے دوسرے اشعار جن میں مرشد شاہ عنایت کی تعریف و توصیف ملتی ہے اور بھی کئی جگہ پائے جاتے ہیں۔

لشب جان اے سبحان نے اپنی کتاب "تصوّف اُس کے صوفیا اور مقبرے" میں ہندوستانی صوفیوں کی ایک فہرست منسلکہ لے (APPENDIX) میں واقعہ نگاری کے ساتھ شامل کی ہے۔ جس میں اُنھوں نے قادری سلسلے کے ۱۱۶ صوفیوں کا حوالہ دیا ہے۔ ان قادری صوفیوں میں شاہ عنایت کا نام ۹۸ ویں صوفی کی حیثیت سے موجود

ہے جن کا مقبرہ لاہور میں واقع ہے۔ اور جن کی موت ۱۷۲۸ء میں ہوئی تھی۔ اسی فہرست میں ۹۸واں نام میر بہلی شاہ کا ملتا ہے جن کا مقبرہ قصور میں ہے اور جن کی وفات ۱۷۵۷ء میں ہوئی تھی۔

بُلھے شاہ کے مختلف نام

بُلھے شاہ کا دوسرا نام میر بہلی شاہ کے طور پر بھی ملتا ہے۔ ڈاکٹر فقیر محمد فقیر نے بُلھے شاہ کے مجموعۂ کلام بعنوان "کلیات بُلھے شاہ" کے تعارف میں مئی ۱۹۳۹ء کے (پنجاب یونیورسٹی لاہور) کے اورنٹیل کالج میگزین کے مشمولہ صفحات میں حوالہ دیا ہے۔ جس میں بُلھے شاہ کا نام میر بہلی شاہ قادری شطاری قصوری ملتا ہے۔ 'تاریخ نافع السالکین' کے مطابق بُلھے شاہ کے باپ نے ان کا نام عبداللہ شاہ رکھا تھا۔ لیکن بعد میں بحیثیت صوفی بزرگ شاعر کے طور پر وہ بُلھے شاہ کے نام سے مشہور ہوئے۔

جائے ولادت

بُلھے شاہ 'پانڈو کی' گاؤں میں پیدا ہوئے تھے جو قصور کے جنوب میں ۱۴ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ لیکن ایک روایت ہے کہ وہ اُوچ گیلانیاں میں پیدا ہوئے تھے۔ 'تاریخ نافع السالکین' کا مصنف لکھتا ہے کہ بُلھے شاہ، شاہ محمد درویش کے بیٹے تھے جو 'اُوچ گیلانیاں' کے گاؤں واقع سندھ میں رہتے تھے۔ یہ گاؤں گیلانی سیّدوں سے آباد تھا۔ شاہ محمد بھی ایک گیلانی سیّد تھے۔ بُلھے شاہ کی پیدائش اسی گاؤں میں ہوئی۔ لاجونتی رام کرشنا نے اپنی کتاب 'پنجابی صوفی شاعر' اور میاں مولا بخش کشتہ نے اپنی کتاب "پنجابی شاعراں دا تذکرہ" میں بیان کیا ہے کہ بُلھے شاہ کی جائے ولادت قصور ضلع لاہور کا 'پانڈو کی' گاؤں ہے۔

خاندانی پس منظر

'تاریخ نافع السالکین' سے بُلھے شاہ کے خاندانی پس منظر کے بارے میں کچھ اطلاعات

فراہم ہوتی ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ سخی شاہ محمد درویش نے اپنے گھریلو حالات کے دباؤ کے سبب اور اپنی فلاح کے پیش نظر اُوچ گیلانیاں کا گاؤں چھوڑ دیا تھا۔ اس وقت بُلھے شاہ کی عمر چھ سال تھی۔ وہ 'ساہی وال' علاقے کے 'ملک وال' میں جا بسے تھے۔ کچھ دنوں بعد چودھری 'پانڈو بھٹی' ملک وال کے نزدیک تلونڈی میں کسی ذاتی سفر پر آئے ان کے دوست احباب ان سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ جب وہ رات کا کھانا کھانے کے بعد مل کر بیٹھے تو کسی عزیز نے ان سے کہا کہ پانڈوکی بھٹی کی نئی آبادی کا کیا حال ہے۔ مہمان نے جواب دیا کہ ہر طرح خیر و خوبی ہے۔ زمین زرخیز ہے سال بھر تک نہایت عمدہ پیداوار ہوتی ہے غریب سے غریب لوگ بھی خوشحال ہیں۔ اور حاکم و مالک کے لیے ہمیشہ دعاگو رہتے ہیں۔ لیکن وہاں ایک کمی یہ ہے کہ بستی کی شاندار مسجد کے لیے کوئی قابل مولوی نہیں جس کی تلاش جاری ہے۔ جب پانڈو نے یہ بات کہی تو دوستوں اور عزیزوں نے انہیں تجویز کیا کہ وہ مولوی جو ابھی کچھ پہلے ملک وال میں آیا ہے شاید پانڈوکی' کی نئی بستی میں جانا پسند کرے دوسرے روز تلونڈی کے کچھ بزرگ پانڈو بھٹی کے ہمراہ شاہ محمد درویش سے ملاقات کرنے ملک وال گئے۔ شاہ محمد نے مسجد کے لیے ان کی درخواست منظور کر لی اور وہ اپنے ساز و سامان سمیت پانڈوکی منتقل ہو گئے۔ شاہ محمد درویش نے مسجد سے متعلق ذمہ داری سنبھال لی اور بُلھے شاہ اپنی ابتدائی تعلیم حاصل کرنے میں لگ گئے۔ ساتھ ہی اُن کو گاؤں کے مویشی چرانے کا کام بھی دیدیا گیا۔

اس بات کا علم نہیں کہ شاہ محمد کے آباو اجداد کہاں سے آئے۔ ابتداً ہندوستان میں کہاں آباد ہوئے۔ 'سَت ستارے' کا مصنف (بحوالہ فقیر محمد فقیرؔ) ایک سکھ تحصیلدار اپنی کتاب میں بیان کرتا ہے کہ پانڈوکی' کی نئی آبادی جنوبی لاہور کی طرف بیس میل کے فاصلے پر باری دوآب کے کنارے پر واقع ہے۔ بُلھے شاہ بخاری سیّدوں کے خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔

سخی محمد درویش کا مقبرہ 'پانڈوکی' گاؤں میں ہے۔ جہاں بُلھے شاہ کے یوم وفات پر ہر سال عرس کی تقریبات منعقد ہوتی ہیں۔ اس روز دور و نزدیک سے قوّال آتے ہیں اور بُلھے شاہ کی کافیاں گاتے ہیں۔

بُلھے شاہ اور شاہ عنایت

بُلھے شاہ کے مرشد کے حالات یا ان کی کافیوں کے علاوہ زندگی سے متعلق کچھ ایسے

واقعات دستیاب نہیں ہوتے جن سے ان کی حیات پر روشنی پڑ سکے۔ جہاں تک ان کی تعلیم کا تعلق ہے۔ ہمیں اتنا معلوم ہے کہ فارسی اور عربی کے مشہور عالم حضرت غلام مرتضیٰ قصوری سے انھوں نے تحصیل علم کیا جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ مشہور قصہ ہیر رانجھا کے مصنف سید وارث شاہ کے ہم جماعت تھے۔ کہتے ہیں کہ بُلھے شاہ شاہ حسین کی طرح عمر بھر کنوارے رہے۔ ان کی ایک بہن تھی جو غیر شادی شدہ تھی اور جس نے اپنی پوری زندگی مراقبے اور دھیان میں گزار دی تھی۔

حالانکہ بُلھے شاہ ایک سید خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ لیکن ان کو مرشد سید نہ مل سکا۔ شاہ عنایت ایک باغبان (ارائیں) تھے، جو مسلم معاشرے میں ایک نیچی ذات تسلیم کی جاتی ہے۔ چنانچہ جب بُلھے شاہ، شاہ عنایت کے مرید ہوئے تو ان کے رشتہ دار اس نسبت پر معترض و ناخوش ہوئے۔ بُلھے شاہ نے خود اپنی کافیوں میں اس واقعہ پر روشنی ڈالی ہے:

بہن اور بہنوئی آئے بُلھا کی
سرزنش کے لیے
سید ہو کر تمہیں کیا ہوا ہے۔
تم اپنے خاندان کی رسوائی کا باعث ہوئے ہو
ہمارا مشورہ مانو! او بُلھا!
اور ایک ارائیں کا دامن چھوڑ دو

بُلھے شاہ نے اس کا جواب مندرجہ ذیل انداز میں دیا۔

جو کوئی مجھے سید کہہ کر پکارتا ہے
اسے جہنم میں سزا ملے گی
جو کوئی مجھے ارائیں کہہ کر آواز دیتا ہے
وہ جنت میں جھولا جھولے گا۔
او بُلھا! تم کو اگر حقیقی راحت کی طلب ہے تو
ایک ارائیں کے مرید ہو جاؤ

کہا جاتا ہے کہ ایک بار مرشد، بُلھے شاہ کی شریعت (مذہب کی ظاہر پرستی) سے کھلی بغاوت کی وجہ سے ناراض ہو گئے تھے۔ بُلھے شاہ نے کہا تھا۔

مصلّے جلادو، وضو کا لوٹا توڑ دو
تسبیح، کاسہ اور سونٹا مت پکڑو
سیدھے راستے اور مخالف سمت قبول کرنے کے لیے
محبت کی عملداری ہی ہمیشہ نئی اور تازہ ہے
جب میں نے محبت کا سبق پڑھا
تو میری ذات میں مسجد کا خوف سما گیا
پھر میری ذات مندر کے احاطے میں داخل ہوئی
جہاں ہزاروں گھنٹیاں بج اٹھیں
محبت کی عملداری ہی ہمیشہ نئی اور تازہ ہے
ہم وید اور قرآن پڑھ پڑھ کر تھک گئے تھے۔
جبینیں گھس گئی تھیں اور عبادت ضائع ہو رہی تھی
خدا نہ تو مقدس جگہوں میں ہے نہ مکہ میں
جس نے بھی اس کو جان لیا یا جس کو بھی اس کا عرفان ہو گیا۔
وہ اس کی نورانی درخشندگی میں ڈوب گیا۔
محبت کی عملداری ہمیشہ نئی اور تازہ ہے

انھوں نے اسی قسم کے خیالات کا اظہار ایک دوسری مناجات میں اس طرح کیا ہے۔

لوگ بلھا سے کہتے ہیں کہ مسجد میں جا کر بیٹھ جا
اگر دل عبادت کی طرف مائل نہیں تو مسجد میں جانے کا فائدہ کیا ہے۔
کیا فائدہ ہے ایسے نہان سے اگر باطن کی گندگی دھل نہ پائے
او بلھا! تیری پوجا بے مقصد ہے اگر تجھے کوئی مرشد کامل نہیں مل پایا
عبادت کو آگ میں جھونک دے، روزوں کو مٹی میں ڈال دے۔
کلمہ پر اندھیرا چھا گیا ہے۔
میرا خدا میرے باطن میں ہے! بلھا کہتا ہے! میں نے اسے پالیا ہے
لوگ بے حاصل تجسس میں ہیں۔

شاہ عنایت جو اپنے مرید کو ایک روحانی نظم و ضبط میں بندھا دیکھنا چاہتے تھے۔ اس

کے باغیانہ اظہار خیالات کی وجہ سے ناراض ہو گئے۔ بُلھا نے اپنے مُرشد کی ہدایت پر کوئی دھیان نہ دیا۔ چنانچہ مرید کا مرشد کی قیام گاہ پر آنا ممنوع قرار دیدیا گیا۔ بہت ہی قلیل عرصہ میں بُلھے کی حالت مرشد کے بغیر ایک ماہی بے آب کی سی ہو گئی۔ مرید نے مرشد کے عالم فراق میں اپنے اندر ایک روحانی کمی کا سا احساس پانا شروع کر دیا۔ یہ صورت حال جب ناقابلِ برداشت ہو گئی تو روحانی اذیت کے عالم میں بُلھے شاعر نے اس طرح اپنی کیفیت کا اظہار کیا۔

لوٹ آعجلت کے ساتھ! اے میرے چارہ گر! میں پژمُردہ ہوا جا رہا ہوں
تیری محبت نے مجھے مستانہ وار رقصِ بسمل میں مبتلا کر دیا ہے
سُورج غروب ہو گیا ہے۔ لیکن ابھی تک سُرخی باقی ہے
میں تجھ پر صدقے ہو جاؤں گا اگر تو میری نظروں کے سامنے لوٹ آئے ایک بار پھر
میں تجھ سے بچھڑ کر ایک شدید ترین غلطی کا مرتکب ہوا ہوں۔
تیری محبت نے مجھے مستانہ وار رقصِ بسمل میں مبتلا کر دیا ہے

بُلھے شاہ نے اپنے مرشد شاہ عنایت کی مہر و محبت دوبارہ پانے کے لیے ایک منصوبہ ترتیب دیا۔ اُنھوں نے شاہ عنایت کو خوش کرنے کے پیش نظر محفل سماع آراستہ کرنے کے لیے موسیقی و رقص سیکھا، سماع ہندوستان میں قوالی کے نام سے مشہور ہے۔ اسلام میں موسیقی کی ممانعت ہے۔ لیکن چشتیہ سلسلہ کے صوفیائے کے یہاں اس کی اجازت ہے وہ موسیقی کی تقریبات منعقد کرتے ہیں۔

بزم سماع کے انعقاد یا موسیقی کی تقریبات کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسے شیخ عبدالقادر جیلانی کے اوّل جانشین شاہ شمس الدین نے ۱۱۷۰ء؁ قادریہ سلسلے میں شروع کرایا تھا۔

اپنے منصوبے کے مطابق بُلھا نے گانا اور رقص کرنا شروع کر دیا جس راہ سے ہر روز شاہ عنایت نماز کے لیے مسجد کو جایا کرتے تھے۔ وہ نہایت سُریلی آواز میں گاتا۔

میں تیرے قربان تیرے صدقے مرے اندر آجا
تو مجھے قبول کر یار کر دے! مرے اندر آجا، مجھ میں سما جا
میرے لیے تیرے جیسا کوئی اور نہیں
میں نے صحرا و بیابان چھان مارے، ساری دنیا دیکھ ڈالی

آجا میرے اندر آجا مجھ میں سما جا

وہ یہ بھی گا تا ہے

اے میرے معشوق رانجھا! میں خود پر کبھی فخر نہ کرسکوں گا
اے میرے محبوب! اگر لے قیام اس رات میرے گھر کے اندر
بھرپور مسکراہٹوں سے مجھے اپنے دل کے رازوں کا رازدار بنالے
اے میرے محبوب !!

بُلھے شاہ کے اس شاعرانہ اندازِ خطابت نے مسجد سے واپسی پر شاہ عنایت کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی۔ آواز کا لب ولہجہ پہچانتے ہوئے مُرشد نے پوچھا! کیا تم بُلھے ہو؟ مُرید جو اپنے مرشد کی زبان سے بات سننے کا نہایت بے صبری سے منتظر تھا۔ بولا! میرے مالک میں بُلھا نہیں، لیکن بُھلّا ہوں! بُھلّا کا مطلب نادم یا شرمندہ ہے۔ مرید کو وہیں کے وہیں اس کی لغزش اور بُھول چُوک پر مُرشد نے معاف کردیا اور پھر سے وہ اپنے مرشد کے دامنِ عاطفت میں آگیا۔ وہ اپنے مالک کے قدموں پر گر گیا جس نے اُسے محبت و مہربانی کے ساتھ بغل گیر کر لیا۔ اس کیف و مستی کے عالم میں بُلھا یوں نغمہ سرا ہوا ؎

آؤ اے دوستو! مجھے مبارکباد دو
میں نے اپنے محبوب رانجھا کی حقیقت کو جان لیا ہے
مقدس دن کا سویرا ہو گیا ہے جب رانجھا میرے صحنِ دل میں
ایک عصا ہاتھ میں ایک کمبل کاندھے پر ڈالے ہوئے
ایک چرواہے کی صورت میں رونما ہوا ہے۔

ایک روایت میں کہا گیا ہے کہ ایک بار بُلھے شاہ نے حاجی ہنس کے نیاز حاصل کیے اور ایک محفل سماع ان کے اعزاز میں منعقد کی اس موقعہ پر کثیر تعداد میں صوفیاء اور فقراء جمع ہوئے۔ بُلھے شاہ کی کئی کافیاں گائی گئیں۔ وجد و حال کی کیفیت میں فقراء نے اپنے سَر ملانے شروع کیے۔ دوسرے روز حاجی ہنس نے نقالوں مسخروں اور بھانڈوں کو دعوت دی تاکہ وہ گزشتہ رات کی سی فقراء کے وجد و حال کی نقل کریں جب بُلھے شاہ کو اس بات کا پتہ ہوا تو وہ بہت غصہ ہوئے انھوں نے ایسے فعلِ نازیبا کے لیے اس شہر والوں کو بد دعا دی اور انجام کار ان کی

بددعا سے یہ مقام ایک ویرانے میں بدل گیا۔ کیسر نام کا یہ شہر پاک پٹن کے قریب آباد تھا۔

بُلّھے شاہ کی ولادت اور وفات کی تاریخیں

بُلّھے شاہ کی "تاریخ ولادت" کے سلسلے میں کوئی مصدقہ ذریعہ نہیں ملتا۔ صرف سی۔ ایف اُسبورن نے اپنے پمفلٹ بعنوان "بُلّھے شاہ" میں ان کا سال وفات سنہ ۱۶۸۰ء بیان کیا ہے۔ جسے عام طور پر اسکالروں نے مان لیا ہے۔ ڈاکٹر فقیر محمد فقیر نے اپنی کتاب 'کلیات بُلّھے شاہ' میں "تاریخ ست ستارے" کا حوالہ دیتے ہوئے سنہ ۱۱۴۸ھ کو بُلّھے شاہ کا سالِ ولادت قرار دیا ہے۔ بہت سے اسکالروں نے "خزینۃ الاصفیاء" کے مطابق سنہ ۱۱۷۱ء کو صوفی کا سالِ وفات مصدقہ طور پر تسلیم کرلیا ہے۔ لیکن ڈاکٹر فقیر محمد فقیر نے ایک تحقیقی مقالے کے حوالے سے بیان کیا ہے۔ جو ۲۴ر فروری سنہ ۱۹۳۹ء میں پنجاب یونیورسٹی عربی فارسی سوسائٹی کے ایک سالانہ جلسے میں پرنسپل مولوی محمد شفیع نے پڑھا تھا۔ جس کی رُو سے فاضل اسکالر کہتا ہے کہ صوفی سنہ ۱۱۸۱ھ تک زندہ تھے اس لیے ہم سالِ ولادت اور تاریخ وفات میں سے کسی ایک کو یقینی طور پر مصدقہ نہیں مان سکتے۔ تاہم زیادہ تر اسکالر اس بات پر متفق ہیں کہ سالِ ولادت سنہ ۱۶۸۰ء اور سالِ وفات کے طور پر سنہ ۱۷۵۸ء کو مان لیا جائے۔

بُلھے شاہ کا عہد

بُلھے شاہ کا دورِ حیات ۱۶۸۰ء سے شروع ہو کر ۱۷۵۷ء تک رہا۔ اس کے ایک حصے میں مغل شہنشاہ اورنگ زیب کا زمانہ اور دوسرے حصے میں اس کے جانشینوں، بہادر شاہ اول (۱۷۰۷ء تا ۱۷۱۲ء) جہاندار شاہ (۱۷۱۲ء تا ۱۷۱۳ء) فرخ سیر (۱۷۱۳ء تا ۱۷۱۸ء) محمد شاہ (۱۷۲۸ء تا ۱۷۴۷ء) احمد شاہ (۱۷۴۸ء تا ۱۷۵۴ء) اور عالمگیر ثانی (۱۷۵۴ء تا ۱۷۵۹ء) کا دورِ حکومت آتا ہے۔ اورنگ زیب نے ۱۶۵۸ء سے ۱۷۰۷ء تک بادشاہت کی۔ بُلھے شاہ کی ولادت اورنگ زیب کے دورِ حکومت کے ۲۲ویں سال میں ہوئی۔ جب اورنگ زیب کی وفات ہوئی تو بُلھے شاہ کی عمر ۲۷ برس تھی۔ اپنی زندگی کے باقی ۱۵ برس بُلھے نے اورنگ زیب کے مذکورہ جانشینوں کے عہدِ حکومت میں گزارے۔

بُلھے شاہ پنجاب میں پیدا ہوئے تھے جہاں اُنھوں نے اپنی زندگی کے پورے دن گزارے۔ چنانچہ یہ ضروری ہے کہ اس دور کے پنجاب کے حالات کا سرسری جائزہ لیا جائے۔

اورنگ زیب کے حکم کے مطابق سکھوں کے نویں گرو تیغ بہادر کی شہادت کے پانچ سال بعد بُلھے شاہ کی ولادت ہوئی تھی۔ شہنشاہ اورنگ زیب جو ایک کٹر سُنّی اور احمد سرہندی کا مرید تھا، پورے ہندوستان کو خالص اسلامی ریاست بنانا چاہتا تھا۔ وہ سب ہندوؤں کو مسلمان کرنا چاہتا تھا۔ اپنے اس مقصد کو بروئے کار لانے کے لیے

اس نے پہلے پرامن اقدامات کیے۔ ان اقدامات کی ناکامی کی صورت میں دولت کا لالچ دیا۔ نامرادی کی حالت میں لوگوں کو سزا کی دھمکیاں دی گئیں اور تمام کوششوں کے ناکام ہونے کے بعد زور زبردستی سے تبدیلیٔ مذہب کے لیے قدم اٹھائے۔ ہندوؤں کے مندروں کو مسمار کرنے کے لیے احکامات جاری کیے گئے۔ گایوں کو ذبح کرکے ان کا گوشت پینے کے پانی کو ناپاک کرنے کے لیے کنوؤں میں ڈلوایا گیا۔ کئی اور بھی جبر واستبداد کے طریقے ہندوؤں کو ڈرانے دھمکانے کے اختیار کیے گئے۔ ان کو اعلیٰ عہدوں سے الگ کر دیا گیا اور جزیہ لگایا گیا۔ — پنجاب میں سکھوں کی تحریک کو کچلنے کی بہت سی کوششیں جاری رکھیں۔ مذہب کی آزادی پر سختی سے پابندی عائد کر دی گئی۔ یہ صرف مذہبی آزادی کے تحفظ کا ہی مسئلہ تھا جس کی وجہ سے گرو تیغ بہادر کو شہادت دینی پڑی۔ ہندوستان کی تاریخ میں یہ ایک اہم واقعہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ سوائے نقشبندی صوفیوں کے تمام دیگر روحانی بزرگوں نے اس ظالمانہ عمل کی مذمت کی تھی۔ چشتی اور قادری سلسلے کے تمام بزرگوں نے سکھ تحریک کو بڑی قدر افزائی کی نظر سے دیکھا تھا۔ سکھوں کے پانچویں گرو ارجن دیو نے اپنی مذہبی کتاب ' آدی گرنتھ ' میں بابا فرید گنج شکر کے اشعار کو خاص جگہ دی تھی۔ بابا فرید چشتیہ سلسلہ کے بہت مشہور صوفی گزرے ہیں۔ عظیم قادری صوفی میاں میر نے گرو ارجن دیو کے قتل کی سخت مذمت کی تھی۔ جنہیں جہانگیر کے حکم سے مارا گیا تھا۔ میاں میر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے ہرمندر (گولڈن ٹیمپل) کا سنگِ بنیاد اپنے ہاتھوں رکھا تھا۔ بُلّھے شاہ اپنے پیش روؤں کی طرح گرو ارجن دیو کی شہادت کے بعد سکھوں کی ابھرتی ہوئی تحریک کے عینی شاہد تھے انھوں نے اپنی ایک کافی میں بصد احترام گرو ارجن دیو کی شہادت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

کِتے چور بنے کِتے قاضی ہو
کِتے منبر تے بہہ وعظی ہو
کِتے تیغ بہادر غازی ہو
آپے اپنا کٹک بنائی دا
ہُن کس توں آپ لکائی دا!

ترجمہ: کہیں تم چور ہو کہیں تم قاضی (منصف) ہو
کہیں تم منبر پر بیٹھ کر وعظ بیان کرتے ہو
کہیں شہید تیغ بہادر ہو
تم اپنی قوت اور طاقت کو خود اپنے اختیار سے تیار کرتے ہو
تم اب اپنے آپ کو کس سے چھپا رہے ہو

ایک مشہور کہاوت بُلھے شاہ سے منسوب کی جاتی ہے۔ جس میں اُنھوں نے گرو گوبند سنگھ کو عظیم خراجِ عقیدت پیش کیا ہے:۔

نا کہوں جب کی نا کہوں تب کی
بات کہوں میں اب کی
اگر نہ ہوتے گرو گوبند سنگھ
سنّت ہوتی سبھ کی

ترجمہ: میں کوئی ماضی کی بات نہیں کہتا میں حال کی
بات کرتا ہوں۔ اگر گرو گوبند سنگھ نہ ہوتے
تو سب کو مذہب اسلام اختیار
کرنا پڑ جاتا۔

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قادری صوفی اعتدال پرست اور شریفانہ ذہن کے لوگ تھے اور اپنے صوفیانہ نظریات کے تحت اُنھوں نے اورنگ زیب کی تبدیلیٔ مذہب کی پالیسی کو کبھی پسند نہیں کیا۔ وہ ہندوستانی سادھو سنتوں کے بھی قدر دان تھے۔ جو خدا کے پالن ہار ہونے اور انسانی بھائی چارہ کا پرچار کرتے تھے۔ گرو گوبند سنگھ ۱۷۰۸ء میں جنوبی ہند کے مقام نانڈیڑ میں سورگباش ہو گئے تھے بُلھے شاہ دسویں گرو کے بعد نصف صدی تک زندہ رہے۔ اٹھارہویں صدی عیسوی کا یہ زمانہ پنجاب کے لیے شورش و بدامنی کا زمانہ تھا۔ بندہ سنگھ جو سکھ دھرم میں نیا داخل ہوا تھا۔ اُس کو جنوبی ہند سے خود گرو نے ایک مشن پر بھیجا تھا۔ وہ بدکردار حکمرانوں اور ظالموں کی سرزنش کے لیے آیا۔ کئی شہر اور قصبات سرہند کی شکست سے قبل اُس کی فوجوں کے قبضے میں آگئے۔ اس کے بعد جالندھر کے دوآب کے علاقے پر

قبضہ کرلیا گیا۔ مسلمانوں نے ایک ہرا جھنڈا (حیدری پرچم) اُٹھایا اور سکھوں کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا گیا۔ اس جہاد کے نتیجے میں جہادیوں کو زبردست شکست ہوئی۔ اس موقع پر شہنشاہ بہادر شاہ اوّل ایک عظیم لشکر لے کر سکھوں کے خلاف صف آرا ہوا۔ لیکن بندہ بہادر اپنے فوجیوں سمیت پہاڑیوں میں جا چھپا اور موقع بموقع دھاوے بولتا رہا۔ بہادر شاہ اوّل فروری ۱۷۱۲ء میں وفات پا گیا۔ اس کے بعد جہاندار تخت نشین ہوا جسے ۱۷۱۳ء میں فرخ سیر نے بادشاہت سے ہٹا دیا۔ فرخ سیر نے آخرکار بندہ اور اس کے فوجیوں کو شکست دی پہلے انہیں لاہور لے جایا گیا اور پھر دہلی جہاں ۱۷۱۶ء میں بندہ سنگھ کو نہایت بے رحمانہ طور پر تہہ تیغ کر دیا گیا۔

بندہ سنگھ بہادر کے قتل کے بعد فرخ سیر نے ایک فرمان جاری کیا۔ جس کی رُو سے افسروں کو ہدایت کی گئی کہ وہ سکھوں کو اسلام لانے کے لیے مجبور کریں اور اگر وہ انکار کریں تو انہیں قتل کر دیا جائے۔ ہر سکھ کے سر کے لیے ایک انعام کا اعلان کیا گیا۔ اس طرح سینکڑوں سکھوں کے سر تن سے جدا کر دیئے گئے اس کے بعد ہی شاہی فرمان صرف اُن سکھوں تک محدود کر دیا گیا۔ جنھوں نے بندہ کے ساتھ مہم میں حصہ لیا تھا۔ چنانچہ وہ سکھ جو خوف سے پہاڑوں میں جا چھپے تھے۔ میدانوں میں پُرامن زندگی گزارنے کے لیے نکل آئے لیکن یہ سب عارضی تھا۔ ۱۷۲۶ء میں عبدالصمد خان گورنر لاہور کی بدلی ملتان ہوگئی۔ اور اس کا لڑکا ذکریا خان جو خان بہادر کے نام سے مشہور تھا۔ لاہور کا گورنر مقرر ہوا۔ —— اس نے اس بہادر فرقے کو اکھاڑ پھینکنے کے لیے اور بھی سخت طریقے اپنائے۔ سکھوں کا تعاقب کیا جاتا رہا اور ان کے قتل کے لیے انعام مقرر ہوتے رہے انجام کار وہ اپنی جان بچانے کے لیے ایک بار پھر روپوش ہونے لگے۔ ان پر ظلم و تشدد کا سلسلہ کئی سال تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ جب یہ سختیاں کرتے کرتے خود حکمران تھک گئے تو انھوں نے سکھوں کو خوش کرنے اور نرمی برتنے کی پالیسی اختیار کی اور ۱۷۳۳ء میں فیض اللہ پور کے کپور سنگھ کو جاگیر کے ساتھ نواب کا خطاب دیا گیا۔ چنانچہ اس طرح سکھوں کو سکھ کا سانس لینا نصیب ہوا۔ اور اُنھوں نے پہاڑیوں سے نکل کر گھروں سکونت اختیار کی۔ لیکن یہ تغیّر بھی عارضی تھا۔ 'بڈھا دل' اور 'ترونا دل' کے نام سے دو دل نواب کپور سنگھ کی زیر سرپرستی سرگرمی کے ساتھ وجود میں آئے۔ 'ترونا دل' کی طاقتور

نقل وحرکت نے حکومت کو چونکا دیا۔ چنانچہ ۱۷۳۵ء میں نواب کو عطا کردہ جاگیر ضبط کرلی گئی۔ ان حالات میں حکومت سے تصادمات ہوئے جس کی وجہ سے حکومت پھر سکھوں کے خلاف صف آرا ہوگئی۔ سکھوں پر پھر ظلم کیا جانے لگا۔ میران کوٹ کے بھائی منی سنگھ، بھائی تارو سنگھ اور مہتاب سنگھ شہید کر دیے گئے۔ ۱۷۴۵ء میں ذکریا خان کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا اس کا جانشین مقرر ہوا جس نے اور بھی سختی کے ساتھ ظلم وستم جاری رکھے اس کے ہندو وزیر دیوان لکھپت رائے نے اپنے بھائی جسپت رائے فوجدار امین آباد کی موت کی وجہ سے طیش میں آکر نہایت مجنونانہ انداز سے سختیاں تیز کردیں۔ لکھپت رائے اور یحییٰ خان کی ذاتی کمان میں ایک زبردست فوج سکھوں کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوئی جو تعداد میں تقریباً پندرہ ہزار تھی۔ سکھوں کو اس اکیلی مہم میں زبردست جانی نقصان ہوا جو پہلے قتل عام یا گھلوگھارا کے نام سے مشہور ہے۔

۱۷۴۷ء میں یحییٰ خان کو اس کے چھوٹے بھائی شاہ نواز خان نے نکال باہر کیا تو دہلی کی حکومت نے اُس کو گورنر تسلیم نہیں کیا۔ چنانچہ اس نے کابل کے بادشاہ احمد شاہ دُرّانی کو ہندوستان پر حملے کے لیے دعوت دی مگر چونکہ اس کا رویہ سفرار کی طرف بہت معقول نہ تھا اس لیے وہ لاہور سے فرار ہوگیا اور احمد شاہ دُرّانی جب لاہور آیا تو اس نے قصور کے افغان حکمران جلہے خان کو لاہور کا گورنر مقرر کردیا۔ مومن خان کو نائب گورنر اور لکھپت رائے کو دیوان بنایا گیا۔ لیکن مارچ ۱۷۴۸ء میں سرہند کے نزدیک دُرّانی کی شکست کی وجہ سے یہ انتظام بھی عارضی ثابت ہوا۔ پھر یحییٰ کے خسر اور دلی حکومت کے وزیر قمر الدین نے اپنے لڑکے میر منّو کو لاہور کا گورنر مقرر کیا۔ میر منّو نے دیوان کوڑا مل کو اپنا وزیر بنایا جو سکھوں سے بہت ہمدردی رکھتا تھا۔ سکھ جو پنجاب کے بہت سے حلقوں میں طاقت پکڑتے جا رہے تھے۔ اگرچہ میر منّو ان کا دشمن تھا لیکن دیوان کوڑا مل کے مشورے پر اُس نے ناموافق حالات میں اُن کی مدد طلب کی تھی۔ ۱۷۵۲ء میں دیوان دُرّانی کے ساتھ لڑائی میں قصور کے پٹھان بایزید خان کی چال کے سبب مارا گیا۔ میر منّو، دُرّانی کا دوست ہوگیا۔ اور اس طرح آقا کی تبدیلی پر وہ خود کو زیادہ محفوظ سمجھنے لگا۔ اُس نے ان سکھوں کے خلاف اقدامات اور بھی زیادہ سخت کر دیے جن سے اس نے کوئی مدد طلب نہیں کی تھی۔

گیانی گیان سنگھ نے قصور کے افغانوں میر مومن خاں اور حسین خان کی زیر سرکردگی دو

مہوں کا ذکر کیا ہے۔ لیکن پنجاب کے وسطی ضلعوں میں سب سے زیادہ تباہ کن حملہ سکھوں کے خلاف خود میر منّو نے کیا تھا جس میں سینکڑوں سکھ مارے گئے تھے اور ان کی عورتوں کی بے حرمتی ہوئی تھی۔ سکھوں کی سرکوبی کے لیے ان کا مسلسل تعاقب جاری رہا۔ ان دنوں کی ایک کہاوت مشہور ہے جس سے منّو کے ظلم و زیادتی پر روشنی پڑتی ہے۔

منّو ساں دی داتری، اسی منّو دے سوئے
جیوں جیوں منّو وڈھدا، اسی دون سوائے ہوئے

ترجمہ: منّو ہماری درانتی ہے اور ہم اس کی کھیتی ہیں
جتنا زیادہ وہ کاٹتا ہے اتنے ہی ہم اور اُگتے ہیں

نومبر ۱۷۵۳ء میں جب کہ منّو سکھوں کا تعاقب کر رہا تھا۔ گھوڑے پر سے گر کر مر گیا۔ میر منّو کی موت کے ساتھ ہی لاہور حکومت اور بھی کمزور ہو گئی تھی۔ سکھوں نے لاہور حکومت کی کمزوری اور احمد شاہ دُرّانی کے متواتر حملوں کا فائدہ اُٹھایا۔ اُنھوں نے اپنی مہمات کو باہر جانے والے اور اندر آنے والے حملہ آوروں کے لیے جاری رکھا۔ دُرّانی کے ۱۷۵۶ء کے چوتھے حملے کے دوران ایک لشکر سکھوں کی سرکوبی کے لیے امرتسر بھیجا گیا۔ اس وقت متبرک تالاب کو تباہ کر دیا گیا۔ احمد شاہ نے اپنے لڑکے تیمور کو تمام مقبوضہ ہندوستانی علاقوں کا نائب السلطنت مقرر کیا۔ سکھ تیمور کا خاص نشانہ تھے۔ لیکن سکھوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کے سامنے وہ ٹھہر نہ سکا۔ ۱۷۵۸ء میں سکھ مرہٹوں کے ساتھ لاہور میں داخل ہو گئے۔ اور جو فوجی تیمور چھوڑ گیا تھا ان میں بہت یا تو مارے گئے یا گرفتار کر لیے گئے۔ حکومت کابل کے ماتحت جالندھر کے فوجدار آدینا بیگ جو لاہور کی گورنری کا خواہشمند تھا۔ اُس نے مرہٹوں اور سکھوں کی مدد طلب کی تھی۔ اُس کو لاہور کا گورنر بنا دیا گیا اور اس دوران اُس نے اپنی طاقت مجتمع کرنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ سکھوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کی وجہ سے صرف چار ماہ تک گورنری کر پایا۔ مرہٹے اپنی بہتری تصور کرتے ہوئے پنجاب سے پہلے ہی چلے گئے تھے۔ چنانچہ آدینا بیگ اپنی ناکامی سے سکھوں کا مخالف ہو گیا۔ اور اس نے دو عدد مہمات ان کے خلاف روانہ کیں۔ سکھوں کے خلاف اس کی زور زبردستی اُس وقت ختم ہوئی جب ستمبر ۱۷۵۸ء

میں اُس کی موت واقع ہو گئی۔

احمد شاہ نے اکتوبر ۱۷۵۹ء میں ہندوستان پر پانچویں بار حملہ کیا۔ سکھوں نے اگرچہ اُس کی پیش قدمی کو روکنے کی بھرپور کوشش کی۔ لیکن وہ لگاتار دلّی کی طرف بڑھتا رہا اور اُس نے اس کے قرب میں رہ کر ایک سال کی مدت گزار دی۔ راستے میں اُس نے مرہٹوں سے بھی کچھ لڑائیاں لڑیں۔ پانی پت کی تاریخی جنگ ۱۷۶۱ء میں لڑی گئی جس میں احمد شاہ کو فتح نصیب ہوئی تھی۔ لیکن جب وہ اپنے وطن واپس لوٹ رہا تھا تو راستے میں اُس کے مالِ غنیمت میں سے بہت کچھ سکھوں کے ہاتھ آ گیا تھا۔ احمد شاہ دُرّانی کا چھٹا حملہ سکھوں پر ایک زبردست دھاوا تھا۔ چنانچہ ۱۷۶۲ء میں ایک سخت کُشت و خون ہوا جو 'ڈا گھلو گھارا' یا دوسرا بڑا قتلِ عام کہا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس قتلِ عام میں تقریباً دس ہزار سکھ مارے گئے تھے۔ اس موقع پر دُرّانی نے اَمرتسر کے مقدس مندر کو بارود سے اُڑا دیا تھا۔ اکتوبر ۱۷۶۴ء کے اپنے ساتویں حملے کے دوران دُرّانی نے سکھوں کو نیست و نابود کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ چنانچہ اس نے اُس تمام سرزمین کو تاخت و تاراج کر دیا جو سکھوں کے وطن کے طور پر مشہور تھی بغیر کسی امتیاز کے لوگوں کا قتلِ عام کیا گیا۔ لیکن بہادر سکھوں نے اپنی نقل و حرکت برابر جاری رکھی اور دُرّانی کی فوجوں کے ساتھ ان کی نوک جھونک مسلسل چلتی رہی۔ جب شاہ کی موت واقع ہوئی تو ۱۷۶۵ء میں بیساکھی کے دن سکھ امرتسر میں جمع ہوئے۔ جہاں اُنھوں نے لاہور پر قبضہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

بلّھے شاہ نے پنجاب کی اس سیاسی صورتِ حال کا بچشم خود جائزہ لیا تھا۔ وہ لاہور کے مسائل و معاملات اور مسلمان افغان اور مغل حکمرانوں کی ایذا رسانی کے باوجود سکھوں کی ابھرتی ہوئی طاقت سے بخوبی واقف تھے۔ اُنھوں نے نادر شاہ اور احمد شاہ کی فوجوں سے پورے ہندوستان کو تباہ و برباد ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ اورنگزیب اور اس کے جانشینوں کی ظالمانہ پالیسی سے بھی واقف تھے وہ نہایت ہی راست باز صوفی تھے۔ یہی سبب ہے کہ ہم کو ان کی کافیوں میں معاصرانہ صورتِ حالات کے حوالے ملتے ہیں۔

اُلٹے ہور زمانے آئے

کاں لگڑ نُوں مارن لگے چڑیاں جُرّے کھائے

عراقیاں نُوں پئے چابک پُوندی گدّے خود لوائے

بُلہا حکم حضوروں آیا تِس نُوں کون ہٹائے

اُلٹے ہور زمانے آئے

ترجمہ: اُلٹا زمانہ آگیا ہے

کوّے شکروں کو مارتے ہیں اور چڑیاں شاہین کو کھاتی ہیں

گھوڑوں کو شکست ہو رہی ہے اور گدھے ہرے گیہوں کی بالیں

چبائے جا رہے ہیں

اعلیٰ اختیارات رکھنے والوں کے احکامات کو کون بدل سکتا ہے

اُلٹا زمانہ آگیا ہے

ساڈوں آمِل یار پیاریا

جدا اپنی اپنی پئے گئی

دھی ماں نُوں لُٹ کے لئے گئی

منہ بارہویں صدی پیاریا

ساڈوں آمِل یار پیاریا

ترجمہ: او محبوب! آ اور ہم سے مل لے

جب ہر ایک خود غرض ہو گیا ہے

بیٹی نے ماں کو لوٹ لیا ہے

بارہویں صدی ہجری کا طلوع ہو گیا ہے

او محبوب! آ اور ہم سے مل لے

در کھلیا حشر عذاب دا
بُرا حال ہویا پنجاب دا
وِچ ہاویاں دوزخ ماریا
سانوں آمِل یار پیاریا

ترجمہ: اذیت اور قیامت کا دروازہ کھل گیا ہے
پنجاب کی حالت بدتر ہو گئی ہے
یہ آہوں اور دوزخ کی پستی میں چلا گیا ہے
او محبوب! آ اور ہم سے مل لے

بُلھا شاہ میرے گھر آوسی
میری بلدی بھاہ بجھاوسی
عنایت دم دم نال چتاریا
سانوں آمِل یار پیاریا

ترجمہ: بُلھا! آقا اور مولا میرے گھر میں داخل ہوگا اور
مصیبت کی جلتی ہوئی آگ کو ٹھنڈا کرے گا
میں اپنے مرشد عنایت کو ہر سانس میں یاد کرتا ہوں
او محبوب! آ اور ہم سے مل لے

مغلاں زہر پیالے پیتے
بھوریاں والے راجے کیتے
سبھ اشراف پھرن چپ کیتے
بھلا اُنہاں نوں جھاڑیا ای
رہو رہو وے عشقا ماریا ای
کہو کس نوں پار اُتاریا ای

ترجمہ: مغلوں نے زہر کے پیالے پی لیے ہیں
کمبل پوش جاٹ بادشاہ بن گئے ہیں
سب شریف لوگ چپ سادھے پھرتے ہیں
اور وہ تیرے ہاتھوں ذلیل و خوار ہو گئے ہیں
اے عشق تو مجھ سے دور ہو جا تو نے مجھے غمزدہ کر دیا ہے
مجھے بتلا تو نے اب تک کس کو پار اتارا ہے

مذکورہ بالا آخری اقتباس میں مغلوں کے ظلم اور پنجاب کے سادہ پوش، بھولے بھالے لوگوں کی فتح و نصرت کا صاف حوالہ ملتا ہے۔ یہ اشارہ سکھوں کی طرف ہے۔ نیز پنجاب کی تباہ کن حالت کی روشنی میں نادر شاہ، احمد شاہ اور تیمور کے قتل عام اور پنجاب کے گورنروں کی سکھوں کو نیست و نابود کرنے کی مہمات کا حوالہ موجود ہے۔ بالواسطہ طور پر اس میں شہیدوں مثلاً حقیقت رائے، اور بھائی منی سنگھ (۱۷۳۵ء) بھائی تارو سنگھ (۱۷۴۵ء) شاہباز سنگھ اور شاہ بیگ سنگھ (۱۷۴۶ء) کے بربریت سے بھرپور قتل کی نشان دہی بھی ملتی ہے۔ علاوہ ازیں مذکورہ حالات میں چھوٹے اور بڑے قتل عام کے واقعات نے بھی بلھے شاہ کی توجہ اپنی طرف مرکوز کی ہوگی۔

بُلھے شاہ کی شاعرانہ خدمات

فارسی یا گورمکھی لپی میں بُلھے شاہ کے مکمل علمی و ادبی کاموں کا کوئی مخطوطہ دستیاب نہیں ہوتا۔ بھائی پریم سنگھ زرگر قصوری جنھوں نے ۱۸۹۶ء میں بُلھے شاہ کی نظموں کا مجموعہ شائع کیا ہے وہ اس کے مندرجہ ذیل تعارفی نوٹ میں تحریر کرتے ہیں۔

"میری ایک زمانے سے آرزو تھی کہ بُلھے شاہ جو نا خواندہ تھے اور جن کی کافیاں کسی مجموعہ میں نہیں ملتیں۔ صرف قوالوں کو یاد ہیں۔ ان کو یکجا کر کے ترتیب دیا جائے۔ یہ کام بہت مشکل تھا اور بڑی محنت چاہتا تھا۔ اپنی اس آرزو کی تکمیل کے لیے میں نے زبردست محنت کرتے ہوئے ایسے قوالوں سے ملاقاتیں کیں جنھیں بُلھے شاہ کی کافیاں ازبر تھیں ایک خاصا وقت اور پیسہ خرچ کرنے کے بعد میں نے یہ مجموعہ تیار کیا ہے۔"

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ بُلھے شاہ کی کافیوں کا یہ سب سے پہلا مجموعہ مختلف ذرائع سے یکجا کیا گیا ہے۔ لیکن بُلھے شاہ کی تعلیم کے بارے میں پریم سنگھ کا بیان صحیح نہیں۔ کیونکہ وہ حافظ غلام مرتضیٰ قصوری کے شاگرد ہونے کی وجہ سے عربی اور فارسی سے واقف تھے اور خود بھی کافیوں کو فارسی انداز میں تحریر کر سکتے تھے۔ یہ عین ممکن ہے کہ صوفی شاعر نے اپنی کافیوں کو اپنے قلم سے تحریر کیا ہو جو پنجاب کی ابتر صورت حال کے سبب ضائع ہو گئی ہوں۔ کافیاں بہت مشہور ہو گئی تھیں اور انہیں موسیقی کی محفلوں میں صوفی اور قوال گایا کرتے تھے۔ پھر یہ عوامی محاورے میں لکھی گئی تھیں۔ چنانچہ ان کا دل نشین

ہوجانا مشکل نہ تھا لیکن پریم سنگھ کے جمع کردہ تمام تر مواد کو بُلھے شاہ سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ ڈاکٹر فقیر محمد فقیر کا بُلھے شاہ کی زبان اور اسلوب کے پیش نظر خیال ہے کہ مذکورہ مجموعہ کا کچھ حصہ مشکوک ہے

ڈاکٹر موہن سنگھ نے ۱۹۳۰ء میں بُلھے شاہ کی پچاس کافیاں ، تعارف ، حواشی ، سوانح اور اشاریہ وغیرہ کے ساتھ شائع کی تھیں۔ اس میں ماخذ کے طور پر پریم سنگھ زرگر کے مذکورہ بالا مجموعہ کا انتخاب بھی شامل ہے۔ دوسرے ماخذ رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز کے ۱۹۰۱ء اور ۱۹۰۴ء کی شائع شدہ شبد شلوک بھگتاں دے ، سے ہیں۔ اور مزید ذرائع جن کا اس میں حوالہ دیا گیا ہے۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے مخطوطات نمبر ۳۷۴ اور نمبر ۴۶۸۴ اور حفظ العلوم لاہور کے مخطوطے ہیں۔ مرتب نے ۷ کافیاں حفظ العلوم کے مخطوطے سے مخطوطات نمبر ۹ و نمبر ۳۷۴ اور ۱۶ مخطوطہ نمبر ۴۶۸۴ اور باقی ۱۹ ، شبد شلوک بھگتاں دے ، سے لیے ہیں۔ آخری ۱۹ کافیاں مشمولہ ، اپریم سنگھ کے مجموعے یا مولوی انور علی روہتکی کے مرتبہ نسخے 'قانونِ عشق' سے ہیں۔ پریم سنگھ کے مجموعہ میں ۱۳۹ کافیاں ، ۴۵ دوہڑے ، ۴ گنڈھے ، ۳ سہ حرفیاں ، ایک بارہ ماہا اور ایک اٹھواڑہ شامل ہیں مجموعہ بعنوان "قانونِ عشق" میں ۱۱۶ کافیاں ہیں۔ مجموعہ مرتبہ پریم سنگھ سمبت ۱۹۵۲ (۱۸۹۶ء) بعنوان "کافیاں حضرت بُلھے شاہ صاحب قصوری" "سیوک مشین پریس لاہور سے شائع ہوئیں۔ 'قانونِ عشق' (۱۳۰۹ھ) (۱۹۵۹ء) کی اشاعت عالم پریس لاہور سے عمل میں آئی۔ پہلے ناشر چانن دین اللہ والے کی قومی دکان ، کشمیری بازار لاہور تھے۔

بُلھے شاہ کی نظموں کے دوسرے مجموعے جو خاص طور پر اہم ہیں۔ ان کی تفصیل حسب ذیل ہے :-

۱۔ کافیاں بُلھے شاہ (بغیر تاریخ) ناشر :- حافظ محمد دین ، کشمیری بازار لاہور ، اس میں ۳۹ کافیاں شامل ہیں۔

۲۔ کافیاں بُلھے شاہ (۱۹۲۵ء۔ ۱۹۰۱ء) ناشر : چراغ دین ، سراج دین۔ کشمیری بازار لاہور ، یہ ۳۸ کافیوں پر مشتمل ہے

۳۔ سائیں بُلھے شاہ ، از : سمندر سنگھ نرولہ (۱۹۳۱ - ۳۲ء) ناشر : بھائی پرتاب سنگھ ، سندر سنگھ ، بازار مائی سیوان امرتسر۔ اس میں ۱۱۶ کافیاں ، ایک بارہ ماہا اور ایک اٹھواڑہ شامل ہیں۔

۴۔ کافیاں بُلھے شاہ (بلغیر تاریخ) ناشر: بھگّو رام اینڈ سنز، نولکھا بازار لاہور
۵۔ کلیات بُلھے شاہ، از: ڈاکٹر فقیر محمد فقیر (سنہ ۱۹۶۰ء) ناشر: پنجابی ادبی اکیڈمی لاہور
اس میں ۱۵۶ کافیاں، ایک اٹھواڑہ، ایک بارہ ماہا، ۴۹ دوہڑے، ۳ سہ حرفیاں اور ۴ گندھے موجود ہے۔ یہ سب بُلھے شاہ کے نام سے ملتے ہیں
۶۔ ڈاکٹر فقیر محمد فقیر نے مندرجہ ذیل مجموعوں کا حوالا دیا ہے۔
(ا) کافیاں میاں بُلھے شاہ (۱۳۲۶ھ) شائع شدہ، لاہور
(ب) کافیاں بُلھے شاہ (سنہ ۱۹۵۱ء) شائع شدہ لاہور
(ج) بُلھے شاہ کی کافیاں (غیر شائع شدہ مخطوط) از: میاں احمد دین، لورائی، ضلع گجرات (پنجاب)

مجموعہ مذکورہ (ا) میں ۵۸ کافیاں اور ۸ دوہڑے ہیں۔ مجموعہ (ب) میں ستر کافیاں ہیں یہ مجموعہ شائع شدہ نسخہ از بھگّو رام، نولکھا بازار، لاہور کی نقل ہے۔

یہاں بُلھے شاہ کی اصناف شاعری کا ایک مختصر سا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ اُنھوں نے کافیاں سہ حرفیاں، دوہڑے، بارہ ماہے، اٹھواڑے اور گندھے لکھے ہیں۔

بعض علماء کا خیال ہے کہ کافی، قافیہ بمعنی نظم کی ایک بگڑی ہوئی شکل ہے۔ لیکن یہ موزوں نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ قافیہ بہت سی اقسام شاعری میں استعمال ہوتا ہے۔ کچھ کے لیے اس کے معنی متعدد بار اشعار کی تکرار ہوتی ہے۔ جب کہ کافی کا انترہ قوالی کے انداز میں بار بار دوہرایا جاتا ہے۔ عام طور پر دو لفظ کافی اور قوالی ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ کافی کا تعلق کیفی سے ہے جس کا مطلب مست و مخمور شخص ہے۔ کافیاں عام طور پر صوفیوں نے لکھی ہیں۔ جن کو خدا کی محبت کا نشہ ہے۔ لیکن کافی ایک راگنی بھی ہے۔ موسیقی کا ایک طرز بھی ہے۔ مگر چونکہ بُلھے شاہ نے سنگیت کے کئی سُروں میں کافیاں لکھی ہیں۔ اس لیے یہ قابلِ یقین نہیں کہ کافی کو اس انداز میں لیا جا سکتا ہے کافی کو قوالی ہی کے روپ کی ایک چیز کے طور پر لیا جا سکتا ہے۔ جس کو خدا کی محبت میں ڈوبے ہوئے مستِ الست لوگ جن میں مسلمان ہی نہیں دوسرے مذاہب کے افراد بھی شامل تھے، گاتے تھے۔ کافی حقیقی طور پر ایک غنائی شاعری ہے جس کا مطلب گایا ہوا ہے۔ پنجابی ادب میں کافی لکھنے کا عمل اتنا ہی قدیم ہے جتنی بھگتی تحریک، سکھ گرووں

نے کافیاں لکھی ہیں جن میں آدی گرنتھ کو شامل کیا جاسکتا ہے۔ کئی صوفیوں، شاعروں اور ہندو سادھوؤں نے بھی کافیاں تحریر کی ہیں۔ مغربی پنجاب میں کافی ایک مقبول وسیلۂ شاعری رہا ہے بلھے شاہ سے قبل وہ صوفی شاعر جس نے کافیاں لکھیں وہ شاہ حسین تھے۔ ان کی کافیاں بھی پنجاب میں اتنی ہی مشہور ہیں جتنی بلھے شاہ کی۔

سہ حرفی حروف تہجی کی بنیاد پر قائم نظم ہوتی ہے۔ جیسے باون اکھری اور پینتی اکھری، اگر باون اکھری کی بنیاد دیوناگری حروف تہجی پر ہے تو پینتی اکھری کی گرمکھی حروف تہجی پر، اسی طرح سہ حرفی کی بنیاد فارسی حروف تہجی پر قائم ہے۔ نظم کا ہر بند حروف تہجی سے شروع ہوتا ہے سارے بند حروف تہجی کے سلسلے سے بندھے ہوتے ہیں۔ وہ صوفی شاعر جس نے بلھے شاہ سے پہلے سہ حرفیاں تحریر کیں سلطان باہو تھا۔ تین سہ حرفیاں بلھے شاہ کے نام سے دستیاب ہوتی ہیں۔ قادر یار ۱۹ ویں صدی کا ایک قصہ گو شاعر تھا۔ جس نے سہ حرفیوں میں اپنا قصہ پورن بھگت لکھا ہے۔

مذکورہ بالا صوفی شاعروں کی سہ حرفیوں میں صوفیانہ خیالات مرکزی طور پر ملتے ہیں۔ ان کی سہ حرفیوں کا ہر ایک بند ایک آزاد خیال پیش کرتا ہے۔ لیکن ان میں تخیلات کی تکرار پائی جاتی ہے۔ بلھے شاہ کی تین سہ حرفیوں میں سے دو مکمل اور تیسری نامکمل ہے۔ صوفی شاعروں کی سہ حرفیوں کو نظر میں رکھ کر اگر دیکھا جائے تو کافی کی طرح یہ بھی ایک غنائی نظم ہوتی ہے جو معروضی طور طور پر اپنے اندر تسلسل رکھتی ہے۔

نظم بارہ ماہا، کی بنیاد سال کے بارہ مہینوں پر قائم ہے۔ اس لیے اگر زیادہ نہیں تو اس میں بارہ بند ضروری ہوتے ہیں۔ ہر مہینے کے ذکر کے ساتھ ساتھ گرد وپیش کے حالات اور ذہنی رویے میں تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ قدیم ترین بارہ ماہے، جو پنجابی میں ملتے ہیں۔ ان میں گرونانک کے (راگ تکھاری) میں اور گروارجن دیو کے (راگ ماجھ) میں ہیں۔ یہ آدی گرنتھ میں بھی شامل ہیں۔ اولین صوفی شاعروں میں بلھے شاہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے بارہ ماہا تحریر کیا ہے۔ بارہ ماہے میں ہندوستانی سال کے بارہ مہینوں کا بیان ہوتا ہے۔ جس میں عام طور سے نظم چیت کے پہلے مہینے سے شروع ہوتی ہے۔ بلھے شاہ کا بارہ ماہا، اسو (اسوج) کے مہینے سے

شروع ہوتا ہے۔ سہ حرفیوں کی طرح بارہ ماہ ہے۔ کبھی قصہ گو شاعروں نے لکھے ہیں۔

اٹھواڑہ وہ نظم ہے جو ہفتے کے سات دنوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہ ستواڑے کے نام سے بھی جانی جاتی ہے پر اس نظم کا صحیح نام کہا جانا چاہیے۔ لیکن چونکہ اتوار کا دن دوہرایا جاتا ہے اس لیے اس کو اٹھواڑہ کہا گیا ہے۔ آدی گرنتھ میں دو ستواڑے ملتے ہیں۔ ایک کبیر کا اور دوسرا سکھوں کے تیسرے گورو امرداس کا۔ عام طور سے نظم اتوار سے شروع کی جاتی ہے۔ لیکن بُلھے شاہ اپنی نظم ہفتے (سنیچر) سے شروع کر کے جمعہ پر ختم کرتے ہیں آخری طویل بند میں جمعہ کا اعادہ کیا جاتا ہے۔ بُلھے شاہ نے دنوں کے نام ایسے ہی استعمال کیے ہیں جیسے مسلمان استعمال کرتے تھے۔ مثلاً سوم کو پیر، برہسپت کو جمعرات اور شکروار کو جمعہ۔

دوہرے عام طور پر چار اشعار کی چھوٹی نظمیں ہوتی ہیں جو باہم ہم قافیہ ہوتی ہیں۔ دوہا یا دوہرا ایک قطعہ کی شکل کی شعر گوئی ہے۔ لیکن بُلھے شاہ کے دوہرے یا تو قطعات یا چار شعروں پر مشتمل چھوٹی نظمیں ہیں۔ بُلھے شاہ کے ۴۹ دوہروں میں سے صرف، چار اشعار کی حقیقی نظمیں اور باقی قطعات ہیں۔

"گندھ" ایک مختصر نظم ہوتی ہے جس کا تعلق شادی بیاہ کی تقریب سے ہوتا ہے۔ اس میں شادی کے انتظامات سے متعلق حوالے ہوتے ہیں۔ مثلاً شادی کی تاریخ کا تقرر، براتیوں کا استقبال، اور شادی شدہ جوڑے کی دائمی وغیرہ، کافی کی طرح گندھ بھی شاعری کی ایک صنف ہے۔ بُلھے شاہ نے چالیس گندھے کہے ہیں۔ پہلا اور آخری گندھ ہر ایک آٹھ اشعار پر مشتمل ہے۔ جبکہ دوسرے گندھ چار چار اشعار کے ہیں۔ بُلھے شاہ کے گندھوں میں روحانی شادی کا بیان ملتا ہے۔ آخری شعر میں لفظ عب۔ اللہ آتا ہے۔ جو بُلھے شاہ کا حقیقی نام ہے۔

بُلھے شاہ کی کافیاں خاص طور پر رُوحانی عشق پر مبنی نظمیں ہیں۔ جن میں عاشق کی مختلف کیفیتوں کی منظر کشی ملتی ہے۔ حالانکہ ان نظموں میں عشق مرکزی خیال کے طور پر موجود ہے تاہم ایسی کافیاں بھی ہیں جن میں طالب کے لیے ہدایت و نصیحت موجود ہے۔ وہ اپنے کردار و فطرت کے اعتبار سے ناصحانہ ہیں۔ لیکن عشق کا عنصر اور ناصحانہ انداز بعض اوقات صرف کافیوں ہی میں نہیں، دوسری نظموں میں بھی کھل کر سامنے نہیں آتے۔

بُلھے شاہ کا مذہبی فلسفہ

خدا کا تصور

صوفیوں کے اشغال کا مرکزی موضوع عشقِ خدا ، رہا ہے بُلھے شاہ کو خدا کے دونوں تصورات یعنی اس کے قادرِ مطلق اور محیط کل ہونے میں عقیدہ ہے۔

احد احمد وِچ فرق نہ بُلھیا
اِک رتّا بھیت مروڑی دا

______ بُلھیا ! احد اور احمد میں کوئی فرق نہیں ، صرف ' م ' میں اس دھاگے کا راز موجود ہے۔

احد پوشیدہ برہمن (نرگن) ہے اور احمد عیاں وظاہری برہمن (سگن) ہے ۔ ' م ' کا دھاگا ' مایا ' ہے ۔ خدا تمام صفات سے الگ ہوکر ' احد ' بن کر دنیا میں نام اور ہیئت سے ظاہر ہوتا ہے ۔ یہ خیال بلھے شاہ نے دوسرے انداز سے اس طرح ادا کیا ہے۔

عین غین دی ہِکّا صورت
وِچ نقطے شور مچایا ہے

______ اردو حروفِ تہجی (ع) اور (غ) کی ایک ہی شکل ہے صرف (غ) کے اوپر کے ایک نقطے نے ہنگامہ برپا کر رکھا ہے۔

اس صورت میں عین پوشیدہ برہمن اور غین ظاہر برہمن ہے یہ نظریۂ تنزّلات یا مختارِ کل کے

نزول کے طور پر معروف ہے۔

بلھے شاہ کا مسلم طرز فکر کے وحدت پرستانہ مکتب سے تعلق ہے جو صرف "ذات مطلق" میں یقین رکھتا ہے۔ یعنی ہر شے خدا یا ہر شے میں جوہر ذات خدا موجود ہے۔ یہ مکتب فکر "وجودیہ" کے نام سے موسوم ہے۔ بلھے کا بیان ہے:

(۱) تسی سبھانی بھیکی تھیندے ہو
ھر جا تسی دسیندے ہو
——— تم تمام بھیسوں میں موجود ہو
تم ہر جگہ دکھائی دیتے ہو

(۲)

کہوں بیر پڑا کہوں بیلی ہے
کہوں مجنوں ہے کہوں لیلی ہے
کہوں آپ گرو کہوں چیلی ہے
——— کہیں وہ دشمن ہے کہیں دوست ہے
کہیں وہ مجنوں ہے کہیں وہ لیلیٰ ہے
کہیں وہ مرشد ہے کہیں مرید ہے

(۳)

کہوں ترک مسلمان پڑھتے ہو
کہوں بھگت ہندو جپ کرتے ہو
کہوں گھور گھونگھٹ میں پڑتے ہو
کہوں گھر گھر لاڈ لڈائی ہے
——— کہیں تم کلمہ پڑھنے والے ترک مسلمان ہو۔
کہیں تم جپ تپ کرتے دھیان میں مست ہندو ہو
کہیں تم نے اپنے اوپر دبیز پردہ ڈالا ہوا ہے
کہیں تم گھر گھر محبت میں ڈوبے ہوئے نظر آتے ہو

کدی ہوا اسمانی بیہندے ہو

کدی اس جگ تے دُکھ سیہندے ہو

کہیں تم بہشت میں تشریف فرما ہو جاتے ہو

اور کہیں اس دنیا کے غموں کو سہتے ہو

ایسی مثالوں کو اور بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ ویدانت میں بیان کیا گیا ہے کہ بہت سی قسم کے زیورات سونے کے بنائے جاتے ہیں۔[۴۲] بلھے شاہ نے مٹی کی مثال دیتے ہوئے کہا ہے کہ اس سے جاندار اشیاء اور دوسری چیزیں پیدا کی گئی ہیں۔ ان کا بیان ہے۔

واہ واہ ماٹی دی گلزار

ماٹی گھوڑا، ماٹی جوڑا، ماٹی دا اسوار

ماٹی، ماٹی نوں دوڑاوے ماٹی دا کھڑکار

مٹی کا باغ کسقدر شاندار ہے

گھوڑا، لباس کا جوڑا، اور گھوڑ سوار سب مٹی کے ہیں

مٹی مٹی کو دوڑا کر شور و شر کرا کے مٹی کو جنم دیتی ہے

بلھے شاہ کے مطابق خدا ہر جگہ موجود ہے رگ و ریشے میں اترا ہوا ہے وہ ایک نُور (جوت) کی مانند جلوہ گر ہے۔ بہت ہی پُر جمال ہے۔ وہ ظاہر بھی ہے باطن بھی ہے آخر بھی ہے وہ واحد بھی ہے اور خالق بھی ہے وہ رحمان بھی ہے اور رحیم بھی ہے اور ان سب پر بڑھ کر یہ کہ وہ شفیق و مہربان بھی ہے وہ ایک ایسا محبوب ہے جو ہماری محبت قبول کرتا ہے وہ مغفرت کرنے والا (غفار) ہے اور کرم کرنے والا (کریم) ہے۔ وہ حق یعنی سچا ہے۔ وہ بصیر یعنی سب کو دیکھنے والا اور انصاف کرنے والا (عادل) ہے۔

بلھے شاہ کو خدا کے فضل و کرم پر بھرپور یقین تھا۔ اگرچہ خدا منصف ہے۔ لیکن وہ فضل و کرم والا بھی ہے۔ بلھا نے کہا ہے:۔

عدل کرے تاں جانا کائیں

فضلوں بکھرا پاویں

اے خدا اگر تو انصاف کرے تو میں کہیں کھڑا نہ رہ پاؤں

لیکن تو اپنے فیض بے پایاں کے صدقے میں مجھے کچھ دے سکتا ہے۔

خدا کے فضل و کرم کے بارے میں بُلھا کا بیان ہے

واہ جس پر کرم ویہا ہے
تحقیق اوہ بھی تیں جیہا ہے
سچ صحیح روایت ایہا ہے
تری لنظر مہر ترجائیں دا

—— یہ بہت عجیب بات ہے کہ جو تیرے دامن کرم میں آجاتا ہے
وہ بلاشک وشبہ تجھ میں سما جاتا ہے
یہ بھی حقیقت میں روایت سچ ہی ہے کہ دنیا کے سمندر
کی کشتیاں تیرے فضل سے پار ہو جاتی ہیں

خدا ان عاشقوں سے آنکھ مچولی کھیلتا ہے جو صرف اُس کا دیدار ہی نہیں چاہتے بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس میں سما جانا چاہتے ہیں۔ بُلھا نے کہا ہے۔

تُسی چھپدے سی اسی پکڑے ہو
اُسی وِچ جگر دے جکڑے ہو
تُسی اجے چھپن نوں تکڑے ہو

—— تم خود کو چھپا رہے ہو لیکن میں نے تم کو جا پکڑا ہے
میں نے تم کو اپنے دل کے قید خانے میں اسیر کر لیا ہے
لیکن تم اتنے طاقتور ہو کہ خود کو چھپائے ہوئے ہو

خودی کا نظریہ :۔ خودی کے سلسلہ میں بُلھے شاہ کا اظہار خیال ہے

نا ہم خاکی نا ہم آتش
نا پانی نا پَون
کُپی دے وچ روڑ کھڑکدا
مورکھ آکھے بولے کَون
بُلھا سائیں گھٹ گھٹ رویا
جیوں آٹے وچ لُون

—— نہ میں مٹی کا بنا ہوں نہ میں آگ ہوں

نہ پانی نہ ہوا
ایک جسمانی چوکھٹے میں مٹی کی آواز کی طرح ہوں
احمق پوچھتا ہے کہ اس میں سے کون بول رہا ہے
بلھا کہتا ہے کہ خدا ہر دل میں موجود ہے اس طرح جیسے کہ
آٹے میں نمک ملا ہوتا ہے

بلھے کے بقول رُوح یا خودی خدا کا جزو لازم ہے۔ وہ ہر رُوح میں موجود ہے اور اپنی خوشی سے بولتا ہے۔ روح جو کچھ بولتی ہے اس کو "ان نفس الناطقہ" کہتے ہیں۔ نفس کا لفظ قرآن اور حدیث میں آیا ہے۔ اس کا مطلب رُوح یا ضمیر قلب یا دل کو نازک روح اور جسم کے باہمی میل کا مقام کہتے ہیں مسلم دینیات میں رُوح کا لفظ آتما کے لیے اور نفس کا لفظ باطن کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ رُوح ایک روشنی بھی ہے جو دل میں رہتی ہے بلھے کا بیان ہے۔

تاں محبوب سرے دی بازی
جس نے کل طبق لے ساجی
من میرے وچ جوت براجی
آپے ظاہر حال بتایا

میں نے محبوب کے لیے اپنے سر کی بازی لگادی ہے
وہ محبوب جس نے ساری دنیا کو پیدا کیا ہے
میرے دل میں رُوح کی روشنی ہے جو جسم کے ذریعہ
اپنی نمائش کر رہی ہے۔

یہ رُوح کی روشنی خدا کی محبت میں مشغول ہے۔ لیکن یہ آزاد خود مختار نہیں، یہ خدا کے حکم کے مطابق مختلف صورتوں میں نقل و حرکت کرتی اور بولتی ہے۔ یہ قادرِ مطلق کی مرضی سے پردۂ زمین پر رقص کرتی ہے۔

بلھا نے کہا ہے:۔

میں میری ہے نا تیری ہے
ایہہ انت خاک دی ڈھیری ہے
ایہہ ڈھیری ہوئی غیری ہے

ڈھیری نُوں نال نچائی دا
ہُن کس تُوں آپ لُکائی دا

—— یہ خودی نہ میری ہے نہ تیری ہے
اس کا انجام ایک مٹی کی ڈھیری کی طرح پر ظاہر ہوتا ہے
یہ مٹی کی ڈھیری رقص کرتی ہے (جب خودی سے الجھتی ہے)
اب تم اپنی خودی کو کس سے چھپا رہے ہو؟

دنیا کا تصوّر

بُلھے شاہ کی نظر میں یہ دنیا دھوکا، فریب یا توہّم کا کارخانہ نہیں بلکہ بہ نسبت دوسری اشیا کے حقیقی ہے۔ اس کی تخلیق خدا نے کی ہے جو خود اس میں بے شمار شکلیں اختیار کر کے ظاہر ہوتا ہے یہ یہاں برہمن کا ظہور ہے۔ یہ دنیا زمان و مکان کی دنیا ہے۔ کیونکہ گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ ساتھ ہر شے تغیّر و تبدّل کی طرف رجوع کر رہی ہے۔ اس لیے گزرے ہوئے کل کی دنیا آج کے لیے خواب ہو جاتی ہے۔ پیدا ہونے کے بعد اشیاء کمال پر پہنچ کر زوال پذیر ہونے لگتی ہیں۔ انسان کے لیے پیدائش، بچپن، جوانی، بڑھاپا اور پھر موت یقینی ہیں۔ وہ لوگ جو مر کر رخصت ہو گئے ہیں ہمارے لیے خواب ہو گئے ہیں۔ بُلھے شاہ نے لکھا ہے:

میں سُپھنا سب جگ دوی سُپھنا
سُپھنا لوک بہانا
خاکی خاک سیوں رل جانا
کُجھ نہیں زور دھنگانا

—— میں ایک خواب ہوں ساری دنیا ایک خواب ہے
لوگ اور رشتہ دار بھی خواب ہیں
وہ جو زمین سے اٹھا ہے زمین میں ہی مل جائے گا
یہ بغیر کسی زور کے رونما ہوگا۔

یہ دنیا رُوح اور مادّے کا ایک کھیل ہے۔ صوفی بُلھے کو مادّے کے مقابلے میں روح کی زیادہ فکر

ہے۔ رُوح کو ایک عاشق کی طرح محبوبِ حقیقی کی طرف سفر کرنا چاہیے۔ رُوح بلھے کے نزدیک ایک ایسا تخم ہے جیسے جب مادّی دنیا میں بویا جاتا ہے تو وہ ایک بلے برگد کا درخت ہو کر بڑھتا ہے۔ لیکن درخت کے زوال کے ساتھ تخم جہاں تھا وہیں کا وہیں بے حس وحرکت ہو کر رہ جاتا ہے۔ بُلھے شاہ نے کہا ہے:

بُلھا، بی بوہڑدا بویا سی
اوہ برکھ وڈا چاہو یا سی
جد برکھ اوہ فانی ہویا سی
پھر رہ گیا بی اکارہ ہے

بُلھا! برگد کا بیج بویا گیا اور یہ ایک زبردست درخت بن گیا
جب اس درخت کو زوال ہوا
تو بیج بغیر کسی حس وحرکت کے
باقی رہ گیا۔

دنیا کی عشرتیں عارضی ہیں ان کا انجام بڑی کلفت اور مصیبت کی حالت میں ہوتا ہے

بُلھا نے کہا ہے:-

کھاویں ماس چباویں بیڑا
انگ پوشاک لگا نیا اے
ٹیڑھی پگڑی آکڑ چلیں
جُتی پَیب اڑانیا اے
اک دن اجل دا بکرا ہو کے
اپنا آپ کُہاویں گا

تم گوشت کھاتے ہو اور پان چباتے ہو
تم نے قیمتی پوشاک پہنی ہوئی ہے
تم ٹیڑھی پگڑی سر پر باندھ کر اور اکڑ کر چلتے ہو
تم اپنے پیروں میں جوتا پہنتے ہو
ایک دن تم موت کی بلی کا بکرا بنا کر قربان کر دیئے جاؤ گے

حجاب کریں درویشی کولوں کب لگ
حکم چلاویں گا
________ تو فقیروں سے پوشیدہ رہ کر کب تک حکم چلاتا رہے گا
یہ باتیں نظر میں رکھتے ہوئے آدمی کو شریفانہ زندگی گزارنی چاہیے اور دوسروں کے لیے
بد باطنی اور خبیثانہ عمل نہیں کرنا چاہیے۔
تمام دنیوی رشتہ دار خود غرض ہیں وہ صرف اپنے مطلب کے یار ہیں۔ بُلھا کا بیان ہے
ایہہ اماں، بابا، بیٹا، بیٹی
پُچھ ویکھاں کیوں روون گے
ایہہ رناں، کنجاں، پُتر، دھیاں
ورثے نوں آن کھلوون گے
ایہہ جو کُٹّن، توں کیوں نا ہی
مر کے آپ لٹاویں گا
حجاب کریں درویشی کولوں
کب لگ حکم چلاویں گا
________ ہم پوچھیں، ماں، باپ، بیٹا بیٹی سے کہ وہ
کیوں روئیں گے
یہ بیویاں، بیٹے اور بیٹیاں اپنے ورثے کا دعویٰ کریں گے
اگر یہ لوٹتے ہیں تو تم کیوں نہیں لوٹتے
تم لُٹ جاؤ گے
جب تم مرو گے
تو فقیروں سے چھپ کر کب تک
حکم چلاتا رہے گا۔
مذکورہ بالا وجوہات سے بُلھے خدا کو باپ، ماں، بہن، بھائی مان کر دیکھا ہے۔ خدا کے
علاوہ اس کا کوئی رشتہ دار نہیں۔

میرا تیرے بن اور نہ کوئی
اماں، بابل، بہن نہ بھائی
———— سوائے تیرے میرا کوئی اور رشتہ دار نہیں
ماں، باپ، بہن نہ بھائی

بلھے شاہ کا ذہن اس دنیا کے انجام کے سلسلے میں بالکل صاف ہے۔ زندگی اور خوشیاں عارضی ہیں اور حقیقی گھر قبر ہے جہاں روح قیامت تک رہے گی۔

اِتھے گوال وا ساوسن نُوں
رہن نُوں اُتھے ڈیرہ ہے
———— اس دنیا میں انسان کو چراگاہ کے چرواہے کی طرح رہنا ہے
اُس کی قیام گاہ قبر ہے

مذہب عملی نقطۂ نظر سے

بلھے شاہ کی منزلِ مقصود عرفانِ الٰہی کا حصول ہے۔ اس مقصد کو پانے کے لیے ان کا عظیم ذریعہ عشق ہے۔ قرآن پر عمل کرنے والے صوفی کے لیے محبتِ الٰہی کی عملی شکل عبادت کرنا یعنی نماز پڑھنا اور روزے رکھنا وغیرہ ہے وہ خدا کا جبار اور قہار ہونا اس کی صفات تصور کرتا ہے اور خدا کے خوف کو اپنے دل میں رکھتے ہوئے ہمیشہ ثابت قدم رہتا ہے۔ موت اور جہنم کا ڈر بھی اس کے دل میں خوف بن کر بسیرا کرتا ہے۔ انجام کار وہ تمام علائق دنیا سے منہ موڑتے ہوئے اپنا ذہن خدا کی طرف مرکوز کرتا ہے۔ اس کے بقول انسان کی اپنی پہچان خدا سے الگ ہے۔ اس لیے وہ خدا کے ساتھ ایک ہونے کا مدعی نہیں ہو سکتا۔ اسے اپنے جذبات پر قابو پانے یا حاوی ہونے کے لیے زبردست ریاضت کرنی پڑتی ہے۔ وہ دنیوی عیش و عشرت سے اجتناب کرتا ہے۔ اس حالت کو 'زہد' کہتے ہیں۔ اس طرح وہ 'فقر' کی منزل میں داخل ہو جاتا ہے۔ لیکن ابھی اس کو خواہشاتِ نفسانی کی طرف مائل ہونے کا خطرہ رہتا ہے۔ چنانچہ وہ 'فقر' اور 'صبر' پر عمل شروع کرتا ہے۔ وہ اپنے عملی رویّہ کا خود نگراں ہوتا ہے اور خود کو ہمیشہ خدا کے حضور میں تصور کرتا ہے۔ وہ مراقبے میں بیٹھتا ہے اور

شدید قسم کے غور و فکر اور دھیان میں ڈوبا رہتا ہے۔ ان تمام اشغال کے بعد وہ حالتِ عشق یا رُوحانی محبت اور وجد کی کیفیت پالیتا ہے۔ یہی عشق بلاشبہ طریقت کا راستہ ہے۔

مذہبی فقیر دو قسم کے ہوتے ہیں پہلے وہ جو سختی سے اسلام کے اصولوں پر عامل ہوتے ہیں وہ باشرع یعنی شریعت پر عمل کرنے والوں کے طور پر مشہور ہیں۔ دوسرے وہ جو اسلامی اصولوں کے سختی سے پابند نہیں۔ اگرچہ وہ بھی مسلمان ہی ہیں ان فقیروں کو بے شرع کہتے ہیں اور یہ اسلامی شریعت پر عمل نہیں کرتے، پہلے فقیر سالک، کہے جاتے ہیں اس لیے کہ یہ شریعت کو مانتے ہیں۔ شریعت پر عمل نہ کرنے والے مجذوب، کہلاتے ہیں۔ یہ بعد کے فقیر مذہبی محویت اور جذب و کیف میں مستغرق ہوتے ہیں۔ بُلھے شاہ کا اسی بعد کے فقرا کی جماعت سے تعلق ہے۔

باوا بدھ سنگھ نے اپنی کتاب بعنوان ہنس جوگ، میں بُلھے شاہ کو پنجاب کا رُومی کہا ہے۔ جلال الدین رُومی ایران کے ایک عظیم صوفی اور عشقِ الٰہی کے ترجمان شاعر تھے۔ ان کا عشق بُلھے شاہ کی طرح عشقِ خدا کا عشق تھا۔ انھوں نے کہا تھا۔ "عشق کی وہ کہانی جو سیاح سناتے ہیں۔ اُسے سُننا ترک کر دو۔ اپنی بھرپور قوت سے خدا کی عبادت کرو۔" انھوں نے یہ بھی کہا کہ" وہ روح جو عشقِ الٰہی میں ملبوس نہیں تو اس کا نہ ہونا ہی بہتر اور اگر یہ ہوتی تو باعثِ شرم ہوتی۔ بغیر کاروبارِ عشق کے محبوب کے یہاں داخلہ ممکن نہیں۔" ہیڈلینڈ ڈیوس نے "وزڈم آف دی ایسٹ سیریز" کی اپنی کتاب بعنوان" فارسی صوفیا" میں جلال الدین رُومی کے بارے میں تحریر کرتے ہوئے مندرجہ ذیل انداز سے رُوحانی عشق پر روشنی ڈالی ہے

"لیکن عشق ایک ایسا رُوحانی جوہر ہے جو اپنے غیر فانی نام کے لیے بیشمار زندگیوں میں سے گزرتا چلا آرہا ہے۔ شخصیت فانی دنیا کی حدود تک محدود رہتی ہے۔ یا زیادہ سے زیادہ لحد کی زندگی تک، ایسا ہی بے گنتی شخصیتوں میں سے چند کے ساتھ رہا ہے کہ انہیں قبر میں جانے کے بعد بھی یاد کر لیا جاتا ہے۔ ورنہ باقی سب فنا ہے۔ ہم انسانی فطرت کے اعتبار سے عشق کرتے ہیں۔ اگر یہ عشق مادّی ہوتا ہے تو محبوب کی موت کے ساتھ فنا ہو جاتا ہے۔ اگر یہ عشق بے پایاں ہوتا ہے اور پاکیزگی، نیکی، فضیلت اور حسین و دلپذیر محبت کے لیے ہوتا ہے تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قائم رہتا ہے۔

مگر یہ تمام چیزیں انسان میں لافانی نہیں ہیں۔ یہ چیزیں رگ و پے میں اتر جانے والے جوہر اور عشقِ روحانی سے تعلق رکھنے والی ہیں۔ محبت خدا کا نور بن کر مردوں اور عورتوں میں

موجود ہے۔ یہ لالٹینوں کی روشنی کی طرح نہیں۔ کیونکہ انسانی جسموں کو خاک ہوجانا ہے۔ انسانوں کی یادیں اور آرزوئیں ختم ہوجانے والی ہیں۔ مگر مکمل پاکیزگی و نیکی اور بھرپور حسن و جمال کا عشق ہی باقی رہتا ہے اور جب یہ سب کچھ ارضی محبت میں پایا جائے تو یہی خدا کی تلاش ہے۔ یعنی خدا تم میں اور تم خدا میں۔ یہی تصوف کی سب سے عظیم تعلیم ہے اور اسی کو مذہبِ عشق کہتے ہیں۔

رُومی کی طرح بُلھے شاہ نے بھی مذہب عشق کی تبلیغ کی ہے اپنے محبوب کے لیے اُس کی اطاعت و خود سپردگی مکمل تھی۔ یہ عشق برائے عشق تھا اور اس کے علاوہ کچھ اور مقصد نہ تھا۔ اُس نے تمام حالات میں صرف اپنے محبوب کی طرف ہی دیکھا۔ اس قسم کی عقیدت ہندوستانی ادب میں" ایکن بھگتی "کے نام سے مشہور ہے۔ بُلھے نے کہا ہے۔

پیا بس کر بُہتی ہوئی
تیرا عشق مری دلجوئی
میرا تدھ بن اور نہ کوئی
اماں، بابل، بہن نہ بھائی

_____ او محبوب! میں نے بہت دُکھ جھیل لیے' اب اسی پر خاتمہ کردے
تیرا عشق میری دلجوئی و دلبستگی کا سامان ہے
تیرے علاوہ میرا کوئی نہیں ہے
نہ ماں' نہ باپ ' نہ بہن نہ بھائی

جیسا کہ سطور بالا میں کہا جا چکا ہے۔ بُلھے شاہ کا عشق ان صوفیاء کے عشق سے بالکل مختلف ہے جو طریقت کے ماننے والے ہیں۔ بُلھے شاہ کے نزدیک شریعت (قانون) دنیا میں ادب آداب یا زندگی کے فرائض کو انجام دینے کی تعلیم دیتی ہے لیکن بُلھے شاہ کا ان رسمیات سے کوئی سروکار نہیں' بُلھے شاہ تو خدا سے وصل کا مشتاق ہے اس لیے اُس نے عشق کا راستہ اپنایا ہے۔ اُس نے بیان کیا ہے۔

کرم شرع دے دھرم بتاون
سنگل پاون پیریں
ذات مذہب ایہہ عشق نہ پُچھدا
عشق شرع دا ویری

——— شریعت کے فرائض وہ راستہ متعین کرتے ہیں
جو ہم کو پابند بناتا ہے
لیکن عشق ہم سے ذات یا مذہب کے بارے میں سوال نہیں کرتا
عشق تو شریعت کا دشمن ہے

بُلھے شاہ کی شاعری کا مرکزی تصور 'عشق' ہے۔ وہ بار بار روحانی عشق کے نغمے گاتا ہے جو بقول اُس کے ایک ایسا شیر ہے جو خون پیتا ہے اور گوشت کھاتا ہے۔ "عشق" کے علاوہ بُلھے شاہ نے پیار کے لیے اپنی کافیوں میں جن الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ ان میں پریم، پیت (پریت) نیہوں، لگن، چیٹک، اور محبت شامل ہیں۔ لیکن عشق لفظ کا استعمال بار بار کیا گیا ہے۔ عشق کے ساتھ تعلق رکھنے والے الفاظ ہیں عاشق (چاہنے والا) اور معشوق (جس سے عشق کیا جائے) بُلھے شاہ کی کافیاں عاشق اور معشوق کے خیالات سے بھری ہوئی ہیں۔ بُلھے شاہ کا بیان ہے:

بُلھا کی جانے ذات عشق دی کَون
——— نا سوہن نا کام بکھیڑے دبّے جاگن سَون
بُلھا عشق کی فطرت کے بارے میں کیا جانے
نہ شناسائی، نہ کام اور نہ کوئی بکھیڑا، خواب و بیداری کا سارا احساس ہی جاتا رہا ہے۔

عشق دو قسم کا ہوتا ہے ۱۔ عشق مجازی یعنی مرد کا عورت سے عشق ۲۔ عشق حقیقی یعنی بندے کا اللہ سے عشق، اگرچہ بُلھے شاہ بڑی استواری کے ساتھ خدا کے عشق میں رنگا ہوا ہے۔ لیکن اُس نے مجازی عشق کی بات بھی اپنی شاعری میں کی ہے۔ اُس نے لکھا ہے۔

جی چرنا عشق مجازی لاگے
سوئی سیوے نا بن دھاگے
عشق مجازی داتا ہے
جس پچھے مست ہو جاتا ہے
——— جب تک عشق مجازی کا مشاہدہ نہ کیا جائے کوئی عشق حقیقی میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

جس طرح کوئی سوئی بغیر دھاگے کے نہیں سی سکتی اسی طرح عشق مجازی ایک ایسا مربی ہے جس کی نیکی کے طفیل عشق حقیقی کا کیف و سرور ملتا ہے

عشق مجازی کے سلسلے میں اسی طرح کا نظریہ بُلھے شاہ کا بھی ہے۔ اس نے ہیر رانجھا کے عشق کو کچھ اس طرح اپنا لیا تھا کہ وہ خود ہیر کا روپ دھار کر اپنے محبوب رانجھا (خدا) کی تلاش میں نکل پڑتا ہے۔ رمی نولڈ نکلسن کے الفاظ میں :

"شاعروں کے خیال کے مطابق خدا ایک ایسا لافانی حسن ہے جو اپنی فطرت کے اعتبار سے معشوق ہونے کی خواہش کرتا ہے۔ اس کا ظہور محبت کے لیے ہوا ہے۔ اور یہی محبت کا حقیقی محرک ہے۔ یہاں تک کہ ارضی محبت بھی ایک قسم کی روحانی محبت ہو جاتی ہے۔ جو حقیقت کی طرف رہنمائی کرنے والے پل کی طرح ہے۔ رُوح اپنے جوہر ذاتی میں مقدس ہے جو اپنی شخصیت کے جداگانہ وجود سے وصال کی آرزومند رہتی ہے جس سے وہ علیحدہ ہو گئی ہے اور یہ کہ اس کی انتہائی آرزو جو اس کو اپنی ذات سے گزرنے اور وجد و انبساط کے پروں پر پھیلنے کے لیے اکساتی ہے۔ ایک واحد ذریعہ ہے جس سے یہ اپنی حقیقی منزل کو لوٹ سکتی ہے۔ محبت ایک ایسی شے ہے کہ اگر یہ اصلی محبت ہے تو بالکل تانبے کی دھات کی طرح آگ میں تپ کر خالص سونا بن جاتی ہے اور اس طرح کی صورت ہر قسم کی مخلوق کے ساتھ پیش آتی ہے۔"

عشق کوئی آسان کام نہیں یہ کانٹوں کی وادی ہے جس کسی نے بھی اس وادی میں قدم رکھا وہ گویا اذیتوں میں داخل ہوا۔ بُلھا نے اس سلسلے میں یوسف، زلیخا، اسماعیل، یونس ؑ، ابراہیم ؑ، سلیمان ؑ، صابر، منصور، ذکریا ؑ، سرمد، شمس، شرف، قلندر، ہیر، لیلیٰ مجنوں، سسی پنوں، سوہنی مہیوال، مرزا صاحباں، رودا جلالی وغیرہ کی مثالیں دی ہیں۔ وہ ہر مثال کے ساتھ دہراتا ہے کہ :

رہو رہو او ڈے عشقا ماریا ای
کہو کس نوں پار اُتاریا ای

_____ او عشق، وہیں رُک جا، تو نے اچھے تازیانے لگائے ہیں

بتلاتا ہے کہ کون کس کو منزل مقصود تک لے گیا ہے

روحانی عشق ہمیشہ تازہ رہتا ہے۔ کافیوں میں سے یہ ایک ٹیپ کا بند ہے۔ عشق ہندو اور مسلمان میں کوئی امتیاز نہیں کرتا۔ بلھا کہتا ہے:

عشق دی نویوں نویں بہار
جد میں سبق عشق دا پڑھیا
مسجد کولوں جیوڑا ڈریا
ڈیرے جا ٹھاکردے وڑیا
جتھے وجدے ناد ہزار

——————— روحانی عشق نئی سے نئی بہار لاتا ہے
جب میں نے عشق کا سبق پڑھا
میرے دل میں مسجد کا خوف پیدا ہوا
پھر میں مندر میں داخل ہوا
جہاں سے سنگیت کے ہزار ساز بجنے کی آواز آتی ہے

عشق کی تخلیق کردہ وجدانی کیفیت نے بلھے شاہ کو باغی بنادیا تھا۔ ایک کافی کے دوسرے بندوں کا آزاد ترجمہ یہاں پیش کیا جارہا ہے۔

"جب میں نے عشق کے راز کو پالیا تو سب 'میں' اور 'تو' ختم ہوئے تمام 'ظاہر' اور 'باطن' غائب ہوگئے۔ اور جہاں کہیں میں نظر ڈالتا ہوں مجھے محبوب ہی دکھائی دیتا ہے ——

ہیر کا رانجھا سے ملن ہوگیا ہے۔ وہ تلاش و تجسس میں سرگرداں صحرا میں گم کردہ راہ ہوگئی تھی۔ لیکن محبوب رانجھا ایک لپٹی ہوئی چادر میں کھیل رہا تھا۔ اسے دیکھ کر میں اپنے ہوش و حواس میں نہ رہا۔ میں وید اور قرآن پڑھ پڑھ کر تھک گیا ہوں۔ میرا ماتھا سجدہ ریزی میں گھس گیا ہے۔ خدا نہ تو مقدس مقامات میں ہے اور نہ مکے میں۔

جس کسی نے اس کا عرفان پالیا، اسی نے اس کے نورِ عظیم کا نظارہ کرلیا۔ مصلیٰ جلادے، بدھنی توڑ دے، تسبیح اور عصا مت تھام۔ عاشق بآوازِ بلند

کہتے ہیں" قانونِ شریعت" کا راستہ چھوڑ دو، ممنوعہ کھانا کھاؤ۔
میں نے مسجد میں اپنی زندگی برباد کی، میرا باطن غلاظت سے بھرا ہوا ہے۔ میں نے نہ عبادت کی نہ توحید کو مانا۔ اب تم کیوں اونچی چیخیں بلند کرتے ہو عشق مجھے سجدہ ریزی کی راہ سے گمراہی کی طرف لے چلا ہے اب تم مجھ سے کیوں جھگڑتے ہو۔ بُلھا اس وقت سخت خاموشی اختیار لیتا ہے جب عشق اپنا طاقت ور سر اُٹھاتا ہے۔"
بُلھا نے عشق حقیقی کا بھی بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے:

عشق حقیقی، نے مٹھی کُٹھی

مینوں دسو پیا دا دیس

عشق حقیقی میرے دل پر قابض ہو گیا ہے

مجھے بتاؤ کہ میرے محبوب کا گھر کدھر ہے

حالتِ عشق میں بُلھا تب سوال کرتا ہے:

کیوں عشق اساں تے آیا ہے

توں آیا ہے میں پایا ہے

اے عشق تو کیوں میرے پاس آیا ہے

تو آیا ہے اور میں نے تجھے پہچان لیا ہے

محبوب سے وصل کے لیے بُلھا اپنے جسم کو ایک آتشدان بناتا ہے اور دماغ کو سندانی جس پر محبت کا ہتھوڑا پڑتا ہے۔ اس صورت میں فولادی دل پگھل اُٹھتا ہے۔

عشق اور علم

اسلامی دینیات کے مطابق مذہبی تعلیم کو 'علم' کہتے ہیں۔ اس کی تین قسمیں ہیں۔
۱۔ علم المآبادی: یہ ابتدائی علم ہے جس کا تعلق قران و حدیث کے متن سے ہے۔
۲۔ علم المقاصد: یہ کامل علم ہے۔ جس کا تعلق ایمان و یقین (مذہب) سے ہے۔

۳۔علم المکاشفہ : یہ وحی الہٰی کا علم ہے۔ اسے علم الحقیقہ یا حقیقت کا علم کہتے ہیں۔ بُلھے شاہ کا شمار صرف اس آخری علم کے ماننے والوں میں ہے۔ جہاں تک کہ شروع کے دو علموں کا تعلق ہے بُلھے شاہ کا ان کے بارے میں بیان ہے :

علموں بس کریں اویار
اِکّو الف تیرا درکار
——— اے دوست! علموں سے گزر جا
حروف تہجی میں سے صرف پہلا حرف 'الف' ہی کافی ہے

'الف' کی اپنی شکل بالکل ہندسہ ایک کی مانند ہے۔ یہ ایک خدا کے تصور کو پیش کرتا ہے۔ چونکہ بُلھا خدا کی حقیقت کے علم سے واقفیت حاصل کرنا چاہتا ہے تو وہ 'الف' یعنی واحد کی علامت سے الگ ہو کر چلنا نہیں چاہتا۔ بُلھا کی کافیوں میں سے ایک مصرعہ یہ ہے۔

اِکّو 'الف' پڑھو چھٹکارا ہے
——— اگر تم نجات چاہتے ہو تو صرف ایک 'الف' پڑھو

اس کافی میں بُلھے شاہ نے کہا ہے کہ واحد 'الف' سے دو تین اور چار ہوئے پھر ہزار، لاکھ، کروڑ اور پھر اَن گنت ہو گئے۔ واحد الف کا نشان عدیم المثال ہے تم گاڑی بھر کتابیں کیوں پڑھتے ہو اور اس طرح مشکلوں کا ڈھیر لیے کیوں پھرتے ہو تم نے خود ایک جلاد کی شکل اختیار کر لی ہے۔ پھر بھی تم کو ایک بہت سخت قطعۂ زمین کی قلعہ بندی کرنی ہے۔ اگر تم نجات چاہتے ہو تو 'الف' کے پار نہ جاؤ۔

وہ باشرع صوفی جنھوں نے شریعت اور طریقت پر گہرائی کے ساتھ عمل کیا ہے انھوں نے صوفی ہونے کے لیے علم شریعت کے مطالعے کو بھی شرطِ اوّل تسلیم کیا ہے لیکن بُلھے شاہ کا تعلق ان بے شرع صوفیوں کے گروہ سے ہے جو اس طرح نہیں سوچتے۔ وہ ویدوں، 'قرآن' اور مذہبی صحیفوں کو دنیا داروں کی چیز سمجھتے ہیں، خدا رسیدہ لوگوں کی نہیں، ان کے مطالعے سے خدا کا عرفان نہیں ملتا، وہ علم جو عشقِ الٰہی سے ملتا ہے۔ وہی سود مند ہوتا ہے۔ بُلھا نے کہا ہے :

حرف عشق دا اِکّو نقطہ
کاہے کوں اُوٹھ لداویں گا
حرفِ عشق صرف ایک نقطے کا نشان ہے
تم کو کیوں اونٹوں پر کتابیں لادتے ہو ؟

حالتِ فراق

روحانی عشق کے تلخ تجربات کی راہ سے گزرتے ہوئے بُلھے بہت بار فراقِ محبوب میں درد کی ٹیس محسوس کرتا ہے. چنانچہ وہ محبوب کو ستم گر اور سنگدل کہہ کر پکارتا ہے .

کیہہ بے درداں سنگ یاری
روون اکھیاں زارو زاری
سانوں گئے بیدردی چھڈ کے
ہجرے سنگ سینے وِچ گڈ کے
جسموں جند نوں لے گئے کڈھ کے
ایہہ گل کر گئے ہتھیاری

اس سنگدل سے محبت کی کیا بات کہوں
میری آنکھیں زار زار روتی ہیں، چھوڑ کے جانے والے
اُس ستم گر محبوب نے مجھے فراق میں مبتلا کر دیا ہے
اور میرے جسم سے جان نکال لی ہے
اُس نے یہ نہایت ظالمانہ انداز سے کیا ہے

عاشق دنیا کی پرواہ نہیں کرتا وہ تمام لعنت وملامت اور طعنے برداشت کرتا ہے اپنے محبوب کے فراق میں ہر طرح کے جسمانی وذہنی کرب تکلیف اُٹھاتا ہے . بُلھے کا بیان ہے .

برہوں آدڑیا وِچ دہڑے
زورو زور دیوے تن گھیرے

دارو درد نہ بجھوں تیرے
میں سجناں باجھ مرینی ہاں
متر پیارے کارن نی میں لوک الاہمے لینی ہاں
——— (برہن) میرے آنگن میں آ گئی اور اس نے اپنی بھرپور
قوت سے مجھے بے ہوش کر دیا
سوائے تیرے میرے درد کا اور کوئی علاج نہیں
میں محبوب کے بغیر مرے جا رہا ہوں
میں محبوب کی خاطر لوگوں کی لعنت و ملامت
اور سرزنش جھیل رہا ہوں

عاشق بے صبر ہو جاتا ہے اور ذہنی کرب سے چلا اُٹھتا ہے

جاگ دیاں میں گھر وچ مُٹھی
کدی نہیں ساں بیٹھی اُٹھی
جس دی ساں میں اوسے کُٹھی
ہُن کی کر گیا بے پرواہی
میرے کیوں چیر لایا ماہی
——— جب میں جاگا تو میں اپنے گھر میں لُٹ چکا تھا
میں اپنے محبوب سے کہیں دور نہیں گیا
لیکن جس سے میرا تعلق ہے اُس نے خود مجھے دغا دی ہے
اُس نے کس شدید لاپرواہی کا رویّہ مجھ سے اختیار کیا ہوا ہے
میرا محبوب کیوں ایک عرصہ دراز سے نہیں آیا

بعض اوقات عاشق انتہائے عشق میں محبوب کو خواب میں دیکھتا ہے جو ایک لمحہ بھر کے لیے ظاہر ہو کر چھُپ جاتا ہے۔ عاشق زبردست روحانی اذیت میں چیخ اُٹھتا ہے ؎

دیکھو نی پیارا مینوں سُفنے میں چھل گیا
——— دیکھو! میرا محبوب خواب میں مجھ سے چال چل گیا

عاشق کی زندگی میں ایک وقت ایسا آتا ہے۔ جب فراق کی رات کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور وصل کی صبح طلوع ہوتی ہے۔ عاشق کیف و سرور کے عالم میں رقص کرتا ہے۔ اور دوسرے طالبوں سے تقاضا کرتا ہے کہ وہ اسے مبارکباد دیں۔

آؤ سیتو! رَل دیوو ودھائی
میں وَرپایا رانجھا ماہی

دوستو! آؤ اور سب مل کر مجھے مبارکباد دو
میرے محبوب رانجھا سے میرا ملن ہو گیا ہے

ہیر بن کر صوفی بُلھے شاہ اپنے محبوب رانجھا کی تلاش میں تھا کہ محبوب ایک یوگی کا بھیس بدل کر آتا ہے اور عاشق خود کو رانجھا کی یوگینی (محبوبہ) کے نام سے پکارتا ہے بُلھا کہتا ہے

رانجھا جوگیڑا بن آیا
واہ سانگی سانگ رچایا
رانجھا جوگی تے مَیں جوگیانی
اس دی خاطر بھر سا پانی
ایویں پچھلی عمر وہانی
اس ہُن میں نُوں بھرمایا

رانجھا (محبوب) جوگی بن کر آیا ہے
اداکار نے ایک بہت ہی عجیب و غریب کھیل کھیلا ہے
رانجھا ایک جوگی ہے اور میں اس کی جوگن ہوں
میں اُس کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہوں
میری پچھلی زندگی بیکار ہی کٹی
اُس نے مجھے اب اپنے چھل بل دکھلائے ہیں

وہ محبوب جس کا بُلھے شاہ کو عرفان ہوا وہ رگ رگ میں سرایت کیا ہوا ہے ہر دل میں موجود ہے۔

سیتو! ہُن میں ساجن پایُوئی
ہر ہر دے وِچ سمائیُوئی
———— او دوستو! اب مجھے اپنے محبوب کا عرفان ہوگیا ہے
جو ہر دل میں بستا ہے۔
بعض اوقات صوفی حیرت واستعجاب میں استفسار کرتا ہے
کون آیا پہن لباس کُڑے
تُسی پُچھو نال اخلاص کُڑے
———— کون اس نئے لباس میں وارد ہوا ہے
او لڑکیو! اُس سے اخلاص کے ساتھ پوچھو
محبوب سے وصل کے لمحات کے دوران بُلھا چاہتا ہے کہ وقت کا حساب کتاب رکھنے والے (گھڑیالی) کو نوکری سے برطرف کردیا جائے۔ "تاکہ وہ عالم وصل میں حرج پیدا نہ کرسکے۔ وہ کہتا ہے۔
گھڑیالی دیہو نکال نی
اج پی گھر آیا لال نی
گھڑی گھڑی گھڑیال وجاوے
رین وصل دی پیا گھٹاوے
میرے من دی بات جے پاوے
ہتھوں چھا سٹے گھڑیال نی
———— گھڑیالی کو نکال باہر کرو
آج میرا محبوب گھر آیا ہے
گھڑیالی وقفوں سے گھنٹے بجا بجا کر
وصل کی رات گھٹائے جا رہا ہے
اگر وہ جانتا ہے کہ میں کون ہوں اور میرے دل میں کیا ہے
تو اس کو اپنے ہاتھ سے گھڑیال (گھنٹہ) پھینک دینا چاہیے۔
صوفی کی زندگی میں ایک مرحلہ ایسا بھی آتا ہے۔ جب وہ دنیا کی ہر شئے میں اپنے

محبوب (خدا) کا نظارہ کرتا ہے۔ بُلھا کہتا ہے

یَں پایا ہے مَیں پایا ہے
تیں آپ سرُوپ وٹایا ہے
کِتے تُرک کتاباں پڑھتے ہو
کِتے بھگت ہندو جپ کرتے ہو
کِتے گھور گھونگھٹ میں پڑتے ہو
ہر گھر گھر لاڈ لڈایا ہے

میں نے محبوب کا عرفان پالیا ہے میں نے محبوب کا عرفان پالیا ہے
تم نے اپنا رُوپ بدل لیا ہے
کہیں تم قرآن پڑھنے والے ترک مسلمان ہو
کہیں دھیان گیان میں ڈوبے رہنے والے ہندو ہو
کہیں تم نے خود پر دہ بر پردے ڈال رکھے ہیں
تم سے ہر گھر میں پیار کیا جاتا ہے

جب خدا کا نورِ اعلیٰ ظاہر ہوتا ہے تو صوفی چپ سادھ لیتا ہے۔ گویا وہ گونگا ہے وہ اسرار و رموزِ نورِ خدا کا انشا نہیں کر سکتا۔ بُلھے شاہ نے اس حقیقت کا اظہار اپنے اشعار میں کیا ہے۔

جدوں ظاہر ہوئے نُور ہوری
جل گئے پہاڑ کوہ طور ہوری
تدوں دار چڑھے منصُور ہوری
اوتھے شیخی مینہڈی نا تیہنڈی اے
منہ آئی بات نا رہندی اے
بے ظاہر کراں اسرار تائیں
سبھ بھُل جاون تکرار تائیں
پھر مارن بُلھے یار تائیں
ایتھے مخفی گل سوہندی اے
منہ آئی بات نہ رہندی اے

———— جب نورِ خدا کا ظہور ہوا
تو کوہِ طور کا پہاڑ جل کر ریزہ ریزہ ہو گیا
پھر منصور کو تختہ دار پر لٹکا دیا گیا
وہاں کوئی شیخی نہیں بگھار سکتا
میں خود کو بولنے سے نہیں روک سکتا
اگر میں اسرارِ خدا کا افشا کر دوں
تو ہر ایک اپنے جھگڑے تکرار کو بھول جائے گا
پھر اپنے دوست بُلھا کی سرزنش شروع کر دے گا
اس لیے یہ مناسب ہے کہ راز کو راز ہی رکھا جائے
میں خود کو بولنے سے نہیں روک سکتا

جس طرح ایک گونگا شخص شیرینی کا مزہ بیان نہیں کر سکتا اسی طرح کوئی صوفی وصلِ محبوب کی وجدانی کیفیت کا اظہار نہیں کر سکتا۔ بُلھے نے بیان کیا ہے۔

جد وصل وصال بنائیے گا
تا گنگے کا گڑ کھائیے گا
سر پیر نا اپنا پائیے گا
———— جب وصل کی حالت کا اندازہ ہو گا
تب اس کا پتہ ایسا چلے گا جیسے گونگے شخص کو گڑ کا مزہ
احساس خودی (دوئی) کا خاتمہ ہو جائے گا

حالتِ وصل کا بیان بُلھا نے مندرجہ ذیل الفاظ میں اس طرح کیا ہے

گل کر دے ساں
گل گھُٹ دے سی
———— جب میں نے اس کی بات کی
میرا گلا گھُٹ گیا

اس عالمِ وصل میں بُلھا اپنی انفرادیت بھول جاتا ہے۔ یہاں صرف یکتائی و یکجائی اور وصل ہے۔ مکمل اوغام اور انضمام ہے اور یہی حالتِ فنا یا عالمِ لاہوت ہے۔ بُلھا کہتا ہے:

مینوں کی ہویا میتھوں گئی گواتی میں
جیوں کملی آکھے لوکاں مینوں کی ہویا؟
میں وِچ ویکھن تے میں نہیں بندی
میں وِچ وسنا ایں توں
سر تو پیر تیک وی توں ہی
اندر باہر توں

مجھے کیا ہوگیا ہے مجھ سے 'میں' غائب ہوگیا ہے
ایک پاگل عورت کی طرح میں کہتا ہوں، لوگو! مجھے کیا ہوگیا ہے
جب میں اپنے اندر دیکھتا ہوں
میں خود کو نہیں دیکھتا، تم میرے اندر رہتے ہو
سرتاپا تم رہتے ہو، اندر اور باہر تم ہی تم
رہتے ہو!

بُلھا کی جاناں میں کون؟

بلھا کہتا ہے میں نہیں جانتا، میں کون ہوں
وہ محبوب صوفی سے آنکھ مچولی کا کھیل کھیلتا ہے۔ بُلھا کے الفاظ میں
تُسی چھپدے سی، اسی پکڑے ہو
تُسی ایجے چھپن توں تکڑے ہو

تم خود کو چھپا رہے تھے مگر میں نے تم کو پکڑ لیا ہے
مگر تم اب بھی خود کو پوشیدہ رکھنے کی قدرت رکھتے ہو

بُلھے شاہ ظاہر اور باطن دونوں طرح عرفان پالیتا ہے۔ ظاہری اعتبار سے مختلف شکلوں میں اور باطنی طور سے نُورِ الٰہی کی صورت میں۔ ہیر (طالب) اپنے مطلوب (محبوب) رانجھا سے ملتی ہے۔ بُلھا کہتا ہے۔

ہیر رانجھے دے ہو گئے میلے
بُھلی ہیر ڈھونڈیندی بیلے

رانجھا یار بغل وچ کھیلے
مینوں سُدھ بُدھ رہی نہ کائی
——— ہیر اور رانجھے کا ملن ہوگیا ہے
ہیر گم کردہ راہ ہوکر اس کی تلاش میں نکل گئی تھی
لیکن محبوب رانجھا اپنے احاطے میں کھیل رہا تھا
میں اپنے سارے حواس کھو بیٹھا تھا۔

صوفی کے ارتقا میں مرشد کا حصہ

مرشد کی رہنمائی میں طالب کو آخری روحانی منزل کا عرفان یعنی عرفانِ الہٰی حاصل ہو سکتا ہے۔ یہ مرشد ہی ہوتا ہے جو ابتدائی منتر یا کلمہ اور قادرِ مطلق کا نام سالک کو دیتا ہے جو اس کی روح کو مدہوش کرتا ہے اور اس کے دل میں جذبات موجزن کرتا ہے۔ سالک کو مرشد سے روحانی فیضان نصیب ہوتا ہے اور وہ علمِ خدا کے راز کا مشاہدہ کرتا ہے جس سے مرشد کا دل بھرپور ہوتا ہے۔ مرشد سالک کے لیے پیرِ مغاں یا مے فروش کی حیثیت رکھتا ہے جس سے وہ عشق الہٰی کی شراب فراہم کرتا ہے۔ سالک اپنے مرشد کی صحبت میں مسرت و شادمانی پاتا ہے۔ کیونکہ مرشد کی ذات خوبیوں سے مزین ہوتی ہے۔ اس لیے سالک مرشد کی رہنمائی سے زندگی میں صفاتِ الہٰیہ قبول کرتا ہے جن کے ذریعہ وہ اپنے روحانی راستے میں استواری کے ساتھ ترقی کر پاتا ہے۔

بُلھے شاہ نے اپنے کئی اشعار میں مرشد کا نام لیا ہے۔ جس کا سطور بالا میں بھی ذکر ہو چکا ہے۔ وہ اس کے بارے میں بڑے ادب و احترام سے ذکر کرتا ہے۔ ایک جگہ وہ کہتا ہے۔

پایا ہے، کچھ پایا ہے
میرے ست گرُو الکھ لکھایا ہے
——— میں نے پالیا ہے کچھ پالیا ہے
میرے سچے گرو نے نامعلوم کو مجھے معلوم کرنے کے قابل بنا دیا ہے۔

بنا مرشدوں کامل بُلھیا
تیری ایویں گئی عبادت کیتی
مرشد کامل کی رہنمائی کے بغیر بُلھیا
تیری عبادت بیکار گئی

محبوبِ حقیقی سے ملنے کے لیے سالک مختلف مرحلوں سے گزرتا ہے۔ بُلھا نے اپنی کافیوں میں سے ایک میں ان مرحلوں پر بھی اظہارِ خیال کیا ہے۔

شریعت میری مائی ہے
طریقت میری دائی ہے
اِکوں حق حقیقت آئی ہے
تے معرفتوں کُجھ پایا ہے
ٹک بُوجھ کون لُک آیا ہے

شریعت میری ماں ہے
طریقت میری دایہ ہے
تب خدا کی حقیقت سمجھ آئی ہے
میں نے معرفت سے بھی کچھ عرفان پایا ہے
ذرا جاننے کی کوشش کر کہ کون مجھ میں چھپ کر آیا ہے

بُلھے شاہ کا مذہبی فلسفہ

مندرجہ بالا اشعار اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ صوفی کو شریعت، نظریہ اور عمل کے ایک ناقابلِ تقسیم وجود کے طور پر تسلیم کرنی ہوتی ہے۔ بُلھے شاہ کی طرح اگرچہ صوفیوں نے دعویٰ کیا ہے کہ وہ شریعت پر عمل کرتے ہیں۔ لیکن دراصل وہ حقیقی روحانی زندگی کے تقاضوں کی راہ پر چلتے ہیں۔ شریعت کے نظم و ضبط نے سالک کو طریقت کی راہ کے لیے تیار کیا ہے۔ شریعت کے محافظ ملّا تھے جنھوں نے بعض اوقات غلط طریقوں پر عمل

کیا۔ بُلھے شاہ جیسے حقیقی روحانی صوفیوں نے ان کے خلاف بغاوت کی۔ عشق میں مستغرق صوفی مذہبی عابدوں کی رسم پرستی برداشت نہ کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ بُلھے شاہ کا نام باغی پڑا۔ جب کوئی صوفی عرفان الٰہی کی راہ میں اونچی پرواز پر ہوتا ہے تو وہ نظم وضبط کی پابندیوں سے تنگ آکر شریعت کے خلاف بغاوت کی آواز بلند کرتا ہے۔ مزید براں روحانی مقام کی بلندی سے پکارتا ہے۔

عشق شرع کی ناطہ؟

عشق کا شریعت کے ساتھ کیا رشتہ؟

وہ آزاد رہتے ہوئے شریعت (قانون) کی پابندی سے اوپر ہوتا ہے۔ شریعت روحانی لقا کی ایک بہت ہی کمتر صورت ہے۔ اسے فطرت انسانی یعنی ناسوت کہتے ہیں۔ شریعت میں مرید قانون کی پابندیوں کے مطابق رہتا ہے۔ پھر وہ دوسرے مرحلے پر فرشتۂ فطرت (ملکوت) بن کر جادۂ خالص (طریقت) میں داخل ہوتا ہے۔ تیسرا مرحلہ قدرت (جبروت) پر قابو پانا جس کے لیے علم (معرفت) ضروری ہے۔ چوتھا اور آخری مرحلہ فنا ہے جس کے لیے (سچائی) (حقیقت) درکار ہے۔ بُلھے شاہ نے ان تمام مرحلوں کو اپنے مرشد شاہ عنایت قادری کے کرم سے طے کیا علم الٰہیہ کے لیے جو متعدد قدم بلھے شاہ نے اٹھائے ان میں عبادت (عبودیت) محبت (عشق) پاکیزگی (زہد) علم (معرفت) انبساط (وجد) سچائی (حقیقت) خدا سے قرب (وصل) اور خدا میں مکمل مستغرق ہونا (فنا) تھے۔ ان تمام ارتقائی منزلوں میں ذکر نے اہم کردار ادا کیا تھا۔

دوسرے مذہبی نظاموں کا اثر

جب کوئی بُلھے شاہ کے کلام کا مطالعہ کرتا ہے تو اس کو اس میں مندرجہ ذیل مذاہب کے اصول وقوانین کے اثرات کا اندازہ ہوتا ہے۔

۱۔ بدھ مت

۲۔ اشراقیت یا نوفلاطونیت

۳۔ ویدانتی فلسفۂ حیات

۴۔ ناتھ ازم

۵۔ ویشنومت

۶۔ سکھ دھرم

ہندوستان میں قادری سلسلے کے صوفی ہندو فکر اور روایات کے ارتقائی عمل کے قریب تر دکھائی دیتے ہیں۔ انھوں نے گہرائی سے ہندوستانی فلسفہ کا مطالعہ کیا تھا۔ شہزادہ داراشکوہ نے کچھ اپنشدوں پر تبصرہ تحریر کیا تھا۔ بلہے شاہ کے مرشد عنایت شاہ نے اپنی تصنیفات میں سے ایک کتاب "دستور العمل" میں نجات حاصل کرنے کے کئی طریقوں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے اہم ترین طریقہ طالب کو 'پرم ہنس' تک پہنچا دیتا ہے۔ یہ علم یونانی صوفیوں پر اپنا بھرپور اثر رکھتا ہے۔ اسے سکندرِ اعظم کے فوجی اپنے ہمراہ لے گئے تھے۔ اس کے بعد یہ یونان سے اسلامی صوفیوں کو حاصل ہوا۔

بدھ مت کا اثر

بلہے شاہ کے عہد میں بدھ مت ایک زندہ مذہب کے طور پر نہیں رہا تھا۔ ابتدائی مراحل میں اس نے تصوف پر اپنے اثرات چھوڑے تھے۔ یہ مشرقِ وسطیٰ کے ملکوں اور مصر میں پھیل گیا تھا۔ تصوف پر بدھ مت کے ابتدائی اثرات بلہے شاہ کی شاعری کے مندرجہ ذیل بڑے اجزا کے تحت تلاش کیے جا سکتے ہیں

۱۔ زہد و تقویٰ

۲۔ متصوفانہ فکر

یہ تصوف کی بنیاد ہیں ان کے علاوہ بدھ مت میں تصوف کے دوسرے نکات دنیا کو غم و الم کا گھر تصور کرنا اور اس سے فرار حاصل کرنا۔ مشاہدۂ نفس کے ذریعہ اپنی کیفیت (حال) کا عرفان پانا، زندگی کو خانقاہ میں رہ کر گزارنا اور پیروں، فقیروں کی پوجا کرنا وغیرہ شامل ہیں بلہے شاہ نے بدھ مت کے ان اصولوں کو روایتی طور پر قبول کیا۔ بلہے شاہ کی شاعری میں غم کا تصور محبوب سے جدائی اور تمام رشتہ داروں میں مروّجہ خود غرضی کے عمل سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔

نوفلاطونیت یا اشراقیت کا اثر

نوفلاطونیت پرستوں کے عقیدے کے مطابق خیر اعلیٰ (سپریم گڈ) تمام اشیا کا سرچشمہ تھا۔ یہ خود پیدا کردہ تھا اس کی پیدائش اس کے وجود کا عکس تھی۔ تب تمام فطرت خدا میں سرائیت کرگئی تھی۔ مادہ عارضی لیکن لگاتار متحرک عکس تھا جس میں روحانیت سماگئی۔ نوفلاطونیت کے قائل اس نظریے کے حامل تھے کہ انسان خیر اعلیٰ (سپریم گڈ) میں وجد اور دھیان کے ذریعہ ضم ہوسکتا ہے۔ ہم کو یہ تمام تصورات صوفیانہ شاعری اور بُلھے شاہ کے کلام میں بھی ملتے ہیں۔ تاہم نوفلاطونیت پرستوں اور صوفیوں کے یہاں خدا کے تصور کے سلسلہ میں ایک اہم فرق ملتا ہے۔ نوفلاطونیت پرستوں کا خدا خالص محسوساتی ہے جس کی تصدیق بآسانی بُلھے شاہ کی شاعری سے کی جاسکتی ہے۔ صوفیوں کا خدا لازمی طور پر ذاتی ہے مختصراً یہ کہ نوفلاطونیت پرستی وجد وحال کا نظریہ تھا۔

ہندو فکر کا اثر

ہندو اور صوفی فکر میں کئی باتیں مماثلت رکھتی ہیں۔ ہندو فکر اپنی انتہا پر ویدانتی فکر ہے۔ برہم سُوتر، اپنشدوں اور گیتا سے پرستھانہ تریئے کی تعمیر ہوتی ہے۔ جس میں ہم برہم ودّیا یعنی خدا کے بارے میں علم پاتے ہیں۔ ہم یہ پہلے سے جانتے ہیں کہ صوفیوں کا وجودیہ مکتب خیال وحدت پرستی کا قائل ہے۔ یہ صرف ایک جوہر یعنی خدا میں یقین رکھتا ہے۔ اس مکتبِ خیال کے لیے ہر شئے خدا ہے اور اس کا عقیدہ ہمہ اوست (سب کچھ وہی ہے) ہے ویدانت کا اسکول بہت قدیم ہے۔ شنکراچاریہ جس نے پرستھانہ تریئے پر تبصرہ تحریر کیا۔ ایک وحدت پرست تھا۔ اس کا فلسفہ 'ادویت' کہلاتا ہے۔ اس کا عقیدہ 'تت توام اسی) (تو ہے وہ) ہے۔ جو بیان کرتا ہے کہ ہر شئے خدا ہے۔ شنکراچاریہ کے مطابق خدا ہی صرف حقیقت ہے خدا ہستیٔ مطلق اور محیط کُل ہے۔ چنانچہ وحدت الوجود کا نظریہ 'ادویتا' سے مماثلت رکھتا ہے۔

اسی طرح وحدت الشہود کا صوفی نظریہ رامانج کے وشِشٹا ادویتا' سے بہت زیادہ

ملتا ہے۔ یہ خدا کی وحدت میں کثرت کے خیال کو پیش کرتا ہے۔ برہما کے تغیّر و تبدل کا ہندو فلسفہ تنزّلات کے صوفی نظریے سے بہت قریب کی مشابہت رکھتا ہے۔ صوفی کے 'فنا' کے نظریے کا اُپنشدی دموکشہ کے تصور سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے

مسلم فلسفے میں مسئلہ تناسخ کے ہندو نظریے کی کوئی جگہ نہیں۔ جیسا کہ بُلھے شاہ نے اپنی کسی ایک کافی میں آواگون کے لفظ کا استعمال کیا ہے۔ 'پنجابی صوفی شاعر' کی مصنفہ لاجونتی راما کرشنا نے خیال کیا کہ بُلھے شاہ مسئلہ تناسخ میں عقیدہ رکھتا تھا۔ لفظ آواگون دنیا میں لوگوں کی عام طور پر آمد، ولادت اور واپسی (موت) کی نشان دہی کرتا ہے۔ دی انڈین مسلم، کے مصنف ڈاکٹر مجیب نے بھی مذکورہ بالا دعوے کو اس لفظ نظر کے ثبوت میں دی گئی مثالوں کی بنیاد پر رد کر دیا ہے۔

عملی زندگی میں سالک کو ایک پیر و مرشد یا ایک شیخ کی روحانی رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ بات ایک ہندو سادھک (عامل) کی عملی زندگی سے بہت گہرا تعلق رکھتی ہے جس کو اپنے روحانی منصوبے کا کام ایک گرو (مرشد) کی نگرانی میں کرنا ضروری ہوتا ہے۔

ناتھ ازم کا اثر

شطاری صوفی شیخ محمد غوث گوالیاری کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے سنسکرت پڑھی اور کچھ کتابیں لکھی تھیں۔ ان کی تصنیف 'کلید مخازن' (خزانوں کی چابی) صوفیانہ تعلیمات کو جیوتش کے نظریات کے ساتھ ملا کر پیش کرتی ہے۔ ان کی دوسری تصنیف "بحر حیات" (زندگی کا سمندر) یوگیوں کے حرکت و عمل، ضبط نفس اور حبس دم کے طریقوں کی اندرونی کیفیت بیان کرتی ہے۔ یوگ کا شطاری عمل اور حبس دم پر قابو پانے کا اثر قادریوں پر بھی اپنا اثر رکھتا تھا۔ سماع میں حبس دم پر قابو کا پہلو 'آداب ذکر' کی شخصی مشقوں کا متوازی تھا۔ یوگ کے اصولوں پر مبنی سنسکرت کی کتاب 'امرت کنڈا'، کا ترجمہ عربی اور فارسی میں بھی دستیاب تھا۔

بُلھے شاہ کو یوگیوں کے حبس دم میں دلچسپی اپنے شطاری بزرگوں سے وراثت میں

ملی تھی۔ اُس نے اپنی ایک کافی میں تحریر کیا ہے۔

تیں کارن جبسی ہوئے ہاں
نو درواجے بند کر سوئے ہاں
دردسویں آن کھلوے ہاں
کدے من میری اَسنائی

تیرے سبب سے میں جبسی ہو گیا ہوں
میں نے نو دروازے بند کر لیے ہیں
(دو آنکھیں، دو کان، دو نتھنے، ایک مُنہ اور ولادت واخراج کے حصّے)
اور ان کے سیاق وسباق میں سو گیا ہوں
میں دسویں دروازے پر کھڑا ہوں
از راہِ کرم میری محبت قبول کرے

بُلھے شاہ اناہت شبد یعنی روحانی نغمہ (UNSTRUCK SOUND)
کی بھی بات کرتا ہے۔

وشنومت کا اثر

ہندوستان میں وشنومت بھگتی مسلک کے طور پر مشہور تھا۔ ایشور سے محبت کا بلند ترین مقام وشنومت ہے۔ جسے 'پراپتی' کہتے ہیں اور جو ایک مکمل ترین خود سپردگی ہے۔ اس مقام پر عاشق وہ آرزو کرتا ہے جس میں محبوب حقیقی کی مرضی ہوتی ہے۔ وہ پکا عقیدہ رکھتا ہے کہ اس کا تحفظ مالک حقیقی کرے گا۔ وہ خود کو ایک ذرّہ کی مقدار تصوّر کرتے ہوئے محبوبِ حقیقی کی خدمت کے لیے پیش کرتا ہے۔ اور اُس کی پناہ کا خواستگار ہوتا ہے۔ بُلھے شاہ کے اشعار میں ہمیں یہ سب عناصر ملتے ہیں۔ وشنو مت میں آخری وقطعی منزل مقصود 'نارائنا' یعنی مالک مطلق کے حضور میں موجود ہونا ہے۔ کیونکہ اس کے فضل وکرم کے بغیر منزل مقصود حاصل نہیں ہو سکتی۔ بُلھے شاہ محبوب حقیقی کے فضل کی بھی بات کرتا ہے۔ اس کی کافیوں میں ہم کو مالک حقیقی کے لیے زوجہ کی

سی عقیدت ملتی ہے۔ وشنومت میں اسے 'کانتا بھگتی' کہا جاتا ہے۔ بلھے شاہ کی شاعری میں کثرت کے ساتھ وشنوی رنگ غالب نظر آتا ہے۔ وہ 'کرشن' اور 'شام سندر' کو محبوب حقیقی مان کر ان کا ذکر کرتا ہے وہ اپنی کافیوں میں سے ایک میں کہتا ہے:

مُرلی باج اُٹھی انگھاتاں
سُن سُن بھُل گیاں سبھ باتاں
سُن سُن شام سندر دیا باتاں
بلھے شاہ میں 'تار' بر لائی
جد دی مُرلی کاہن بجائی
باؤری ہو کے تیں ول دھائی
کھوں جی کِت دل دست براتاں

—— محبوب کرشن، اچانک مُرلی بجا رہا ہے
میں اُس کی مرلی اور باتیں سُن کر سب سدھ بدھ بھول گیا ہوں
جب محبوب نے مُرلی بجائی میں روحانی اذیت سے چلایا
میں پاگل ہو کر محبوب کی طرف دوڑ اٹھا
عاشق (گوپی) پوچھتی ہے کہ پیار کا تحفہ
کس کے ساتھ بانٹا جا رہا ہے

دوسری کافی میں بلھے شاہ اپنے محبوب کو کاہن (کرشن) کہہ کر مخاطب کرتا ہے

بنسی کاہن اچرج بجائی
—— محبوب کرشن نے نہایت حیرت کن انداز سے مُرلی بجائی ہے

سِکھ دھرم کا اثر

قادری صوفی سکھ تحریک کو عزت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ سکھوں کے پانچویں گرُو گرو ارجن دیو کی درخواست پر عظیم قادری صوفی میاں میر نے گولڈن ٹیمپل (سورن مندر) کا سنگِ بنیاد رکھا تھا۔ بلھے شاہ خود بھی بڑے ادب و احترام کے ساتھ سکھوں کے نویں گرُو گرو

تیغ بہادر کو ان کی بے مثال شہادت اور دسویں گرو، گرو گوبند سنگھ کو بھی بداطوار حکمرانوں کے خلاف، کسانوں کو فوجی طاقت میں منظم کرنے کی وجہ سے یاد کرتا ہے، وہ کہتا ہے:

کہوں تیغ بہادر غازی ہو
کہوں اپنا، پنتھ بنایا ہے

——— کہیں تو (اے محبوب حقیقی) تیغ بہادر شہید ہو کر ظاہر ہوتا ہے
اور کہیں تو نے اپنا راستہ خود بنایا ہے

'پنتھ' سکھ تحریک کے حوالے کے طور پر لفظ آتا ہے۔ سادہ کپڑوں میں ملبوس سکھ کسانوں کو بلھا نے 'بھوریا والے' کا نام دیا ہے۔ جنہوں نے مغل حاکموں کے خلاف آواز بلند کی تھی۔ سکھ اور صوفی دونوں خدا کے واحد ہونے کے قائل تھے اور اپنی روحانی زندگی کی جدوجہد میں اپنے مرشدوں سے روشنی پاتے تھے۔ دونوں راگ رنگ کی محفلیں منعقد کرتے اور خدائے بزرگ و برتر کی تعریف کے نغمے گاتے تھے۔ موسیقی کی طرزوں میں راگ اور راگنیاں دونوں کو پسند تھیں۔ بلھے شاہ نے بہت سے راگوں میں اپنی کافیوں کو ترتیب دیا ہے۔

بُلھے شاہ کی شاعری کا اسلوب

پنجابی صوفیانہ شاعری کے سیاق و سباق میں

پنجابی صوفیانہ شاعری پر ایک مختصر نوٹ

پنجابی صوفیانہ شاعری عام طور سے غنائی شاعری ہے۔ شاہ حسین اور بُلھے شاہ کی کافیاں خوش آہنگ گیت ہیں جو مقامی بولی میں ہونے کے سبب سے طالبانِ حق کے دلوں میں گہری جگہ رکھتے ہیں۔ یہ گیت ان کے فلسفے کو پیش کرتے ہیں۔ بابا فرید کے زمانے میں صوفی شاعروں نے شعرگوئی اور شاعری کی مشہور اقسام کو اختیار کیا ہے۔ بابا فرید نے شلوک (زیادہ تر قطعات) اور پد (مناجاتیں اور بھجن) لکھے۔ ان کے پد اور شاہ حسین اور بُلھے شاہ کی کافیاں راگ راگنیوں (موسیقی کے سُروں) میں ترتیب دیئے گئے تھے۔ صوفی شعراء نے شعرگوئی کے لیے عام طور پر جو ہیئتیں استعمال کیں اُن میں دوہرے، دوتیاں، چوپائیاں اور بیت شامل ہیں۔ شاعری کی اقسام جو انھوں نے اپنائیں اُن میں کافیاں، دوہرے، بارہ ماہے، سہ حرفی، اور اٹھواڑہ وغیرہ ہیں۔

صوفیانہ شاعری بھی تشبیہوں، استعاروں اور علامتوں کے اعتبار سے نہایت شاندار ہے۔ جیسا کہ فارسی صوفیانہ شاعری میں صُراحی، پیالہ، پگڑیاں اور پُر لطف لفظی صنعت گری سے بھرپور استعارے بہت مقبول تھے۔ ایسے ہی پنجابی صوفیانہ شاعری میں ترنجن (چرخہ کاتنے والی بہنیں) اور جھنا (چناب، محبت کا دریا) کے استعارے بہت پسندیدہ ہیں ہیر اور رانجھا کے عشق نے داستان گو شاعروں کے ذہن کو اپنی طرف اس طرح مرکوز کیا کہ اس

نے ہیر (عاشق) اور رانجھا (معشوق) کی دو علامتیں صوفی شعرا کو دیں۔ طالب ایک ایسی ہیر کی علامت کی طرح ہے جو اپنے معشوق رانجھا سے ملنے کے لیے گھلنے لگتا ہے۔ 'دنیا' 'پیکا گھر' (والدین کا گھر) کی علامت ہے اور محبوب حقیقی کا مسکن 'ساہورا گھر' (سسرال کا گھر) ہے۔ 'پیکا گھر' میں ترنجھن (چرخہ کاتنے والی بہنیں) ہیں۔ جہاں اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں ان کو محبوب حقیقی کے لیے ایک بہتر تحفہ تیار کرنا ہوتا ہے۔ ان کو اپنے جسم کا چرخہ چلا کر نیکیوں کے دھاگے سے روئی تیار کرنی ہوتی ہے۔ صوفیانہ شاعری میں دنیا کے انسان کو ایک مسافر اور ایک سوداگر کی علامت سے بھی ظاہر کیا گیا ہے۔ یہ دنیا ایک راستے کی سرائے ہے۔ جہاں مسافر اور سوداگر کا قیام بہت مختصر ہے۔ بُلّھے شاہ نے کرشن اور رام کی علامتیں بھی خدا کے لیے استعمال کی ہیں۔ وہ کہتا ہے:

بندرابن میں گئوآں چرائیں
لنکا چڑھ کے ناد وجائیں
مکّے دا حاجی بن آئیں
واہ وا رنگ وٹائی دا
ہُن کِس توں آپ چھپائی دا

تم بندرابن میں گائیں چراتے ہو
اور لنکا میں قرنا بجاتے ہو
تم مکّے کے حاجی بن جاتے ہو
تم اپنا رنگ روپ (ہیئت) حیرت انگیز طور پر بدلتے ہو
اب تم کس سے خود کو چھپاتے ہو

صوفی شاعروں نے پنجابی شاعری کو بہت مالامال کیا ہے۔ انھوں نے اپنے اشعار میں پنجابی تہذیب کی خاص انداز سے منظر کشی کی ہے۔ ہندوستانی گروؤں اور سنتوں کی طرح انھوں نے اپنے روحانی رجحان و میلان سے ملکی و وطنی زندگی کی فلاح و اصلاح کے لیے بڑھ چڑھ کے حصّہ لیا ہے۔

بُلّھے شاہ کا شاعرانہ اسلوب

کارلائل نے 'سرتیری سرتوس' میں تحریر کیا ہے: "یہ آفاق خدا کی ایک وسیع علامت ہے۔ بلکہ اگر تم ذرا

غور سے کام لو تو خود انسان کیا ہے۔ یہ بھی خدا کی ایک علامت ہے۔" خالق نے دنیا میں بے گنتی علامتیں پیدا کی ہیں۔ شاعر یا مصوّر جو شاعری کی تخلیق یا مصوّری کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ وہ اپنے کام میں مختلف علامتیں تخلیق کرتا ہے۔ یہ سب اُس کے تخیّل کی عملی تصویریں ہوتی ہیں۔ صوفی یا کسی اللہ والے کا ذہن اس وسیع کائنات میں اللہ تعالیٰ کا نظارہ کسی جگہ بھی اور جہاں کہیں بھی وہ چاہے کر سکتا ہے وہ خدا کو عالمِ اسفل، روئے زمین یا جنت میں کسی بھی مقام یا لباس و وضع میں دیکھ سکتا ہے۔ بُلھے شاہ موحّد ہے اور وحدتُ الوجود کا قائل بھی، چنانچہ قادرِ مطلق اس کے لیے ہر شئے میں جاری و ساری ہے وہ ہر جگہ موجود ہے۔ عالمِ عرفان میں بُلھا کہتا ہے:

ہُن کس تھیں آپ چھپائی دا
کِتے مُلّاں ہو بُلیندے ہو
کِتے سنّت فرض دسیندے ہو
کِتے رام دہائی دیندے ہو
کِتے متھے تِلک لگائی دا
بیلی اللہ والی مالک ہو
تُسی آپے اپنے سالک ہو
آپے خلقت آپے خالق ہو
آپے امر معروف کرائی دا
کدھرے چور ہو کدھرے قاضی ہو
کِتے منبر تے بہہ وعظی ہو
کِتے تیغ بہادر غازی ہو
آپے اپنا کٹک چڑھائی دا
بُلھا شاہ ہُن صحیح سنجاتے ہو
ہر صورت نال پچھاتے ہو
کِتے آتے ہو کِتے جاتے ہو
ہُن میتھوں بھُل نا جائی دا
ہُن کس توں آپ چھپائی دا

تم خود کو اب کس سے چھپاتے ہو
کہیں تم مُلّا بن کر نماز پڑھتے ہو
کہیں سنت اور فرض کی بات کرتے ہو
کہیں رام کے نام پر انصاف کی دہائی دیتے ہو
کہیں ماتھے پر تلک لگاتے ہو
کہیں تم مالک و مختار ہو
کہیں سالک بنے ہوئے ہو
تم نے خود اپنے آپ کو پیدا کیا ہے
تم خود احکام جاری کرتے ہو اور خود ہی قابلِ ادراک بناتے ہو
کہیں چور اور کہیں قاضی (منصف) ہو
کہیں منبر پر بیٹھ کر وعظ بیان کرتے ہو
کہیں شہید تیغ بہادر نظر آتے ہو
کہیں اپنی فوجوں کو چڑھائی کے لیے بھیجتے ہو
بُلہے شاہ کہتا ہے کہ اب میں تمہیں پہچان گیا ہوں
ہر صورت اور ہر روپ میں پہچان گیا ہوں
کہیں سے تم آتے ہو اور کہیں جاتے ہو
اب تم مجھ کو بھول نہ جانا
اب تم خود کو کس سے چھپاتے ہو

لیکن بُلہا ایک خاص بھیس خود اختیار کرتا ہے اور ایک مخصوص وضع اپنے مالک کے لیے بناتا ہے۔ وہ چونکہ اپنے مالک سے نہایت جذباتی طور پر محبت کرتا ہے۔ چنانچہ مالک کی زوجہ یا عورت بن کر اداکاری کرتا ہے۔ جہاں کہیں بھی وہ اپنی محبت کی شدت کا اظہار کرتا ہے وہاں خود کو مشہور عاشق ہیر کے طور پر پیش کرتا ہے جو اپنے محبوب رانجھا کی تلاش میں ہے۔ پنجابی صوفی بھگتی تحریک کے دوسرے سنتوں کی طرح خود کو ایک عورت کی علامت کے طور پر اختیار کرتے ہیں اور اپنی محبوب و معشوق عورتوں شیریں اور لیلیٰ کی جدائی میں ناتواں ہو جاتے ہیں۔ ہندوستانی صوفیوں نے ہندو سادھو سنتوں جیسی علامات اپنائی ہیں اور اسی

سرزمین کے فرزند ہو گئے ہیں۔

ہیر اور رانجھا کی علامتیں شروع میں شاہ حسین کی کافیوں میں استعمال کی گئی تھیں بُلہے شاہ نے اس سلسلے میں ان کی تقلید کی، دل میں اپنے محبوب رانجھا کے ذکر کے ساتھ ہیر نے اپنے مالک حقیقی سے وصل حاصل کر لیا تھا۔ خدا کے عرفان میں ڈوب کر بُلہا مندرجہ انداز سے نغمہ چھیڑتا ہے۔

رانجھا رانجھا کردی نی میں آپی رانجھا ہوئی
سدّوئی مینوں دھیدو رانجھا، ہیر آکھو کوئی

اپنے محبوب رانجھا کا نام جپتے جپتے میں خود رانجھا ہو گئی ہوں مجھے کوئی بھی ہیر نام سے نہ پکارے مجھے صرف رانجھا کے نام سے آواز دو

ہیر رانجھا کی عشقیہ داستان میں رانجھا ایک جوگی کا بھیس بدل کر اپنے گاؤں تخت ہزارہ سے ہیر سے ملنے کے لیے اس کی سسرال آتا ہے۔ ہیر جدائی کے ایک طویل وقفے کے بعد اپنے محبوب سے ملنے کے لیے خوشی سے بیتاب ہے۔ بُلہے شاہ ہیر کے رُوپ میں اپنے محبوب حقیقی کی آمد پر مندرجہ ذیل گیت گاتا ہے۔

بُلہا شاہ دی ایہہ گت پائی
پیت پُرانی شور مچائی
ایہہ گل کیکوں چھپائی چھپائی
نی تخت ہزاراں دھایا
رانجھا جوگیڑا بن آیا
واہ سانگی سانگ رچایا

بُلہا نے اپنے محبوب حقیقی کا راز پالیا ہے
اس نے اپنی بہت پُرانی محبت کا جواب دیا ہے
اس حقیقت کو کیسے چھپایا جا سکتا ہے
رانجھا تخت ہزارا سے ایک جوگی کے روپ میں آیا ہے
اس بہروپیے نے کیا بہروپ دکھایا ہے

چونکہ بُلھے شاہ کی شاعری کا مرکزی خیال عشق ہے چنانچہ اس نے اس ضمن میں متعدد استعاروں کو جنم دیا ہے۔ عشق کو ایک شیر، ایک قصاب، ایک جنگل، ایک بگل اور ایک مُلّا وغیرہ کی صورت میں پیش کیا ہے۔ شیر کی حیثیت سے تو یہ گوشت کھاتا ہے اور خون پیتا ہے۔ قصاب بن کر اس نے خدا سے محبت کرنے والے بہت سے بندوں کو راستے سے ہٹا دیا ہے۔ جن کے نام بُلھے شاہ نے مشرق وسطیٰ اور ہندوستانی تاریخ اور مذہبی واقعات سے لے کر پیش کیے ہیں۔

ہر اس بنی نوع انسان کی منزل مقصود خدا کا عرفان ہے جس کا مسکن ہر روح کے لیے حقیقی مسکن ہے۔ چنانچہ ہر انسان کے لیے کنواری (مجرّد) دوشیزہ کی علامت اس لیے استعمال کی گئی ہے کہ اس کو اپنے والدین کا گھر چھوڑ کر آخرکار اپنے مالک کے گھر جانا ہے۔ اس اعتبار سے یہ دنیا پیکا گھر (والدین کا گھر) ہے اور مختار کل کا گھر (سُواہرا گھر) سُسرال ہے۔ لیکن اس کنواری کا اپنے مالک کے گھر میں عزت کے ساتھ خیر مقدم کیا جائے گا جس نے اپنے والدین کے گھر (اس دنیا) میں رہ کر ایک ایسا تحفہ تیار کیا ہے جس سے وہ اپنے مالک کی نظر میں ایک سگھڑ یعنی لائق سمجھی جائے گی۔ بلھے شاہ دنیا کے انسان کو ایک کنواری (کُڑیے) کہہ کر مخاطب کرتا ہے۔ کنواری کو سُوت کاتنے والے پیہہ (جسم) پر اپنا جہیز (پسندیدہ خصائل) کو تیار کرنا ہے۔ ہماری روح جسم میں ہے ہمیں الٰہیہ (روحانی) خوبیاں اپنے دل پر نقش کرنی ہیں تاکہ ہم مالک حقیقی کے محبوب ہو جائیں بُلھے شاہ نے کہا ہے:

کر کتن دل دھیان کڑیے

چرخہ بنیا خاطر تیری

کھیڈن دی حرص تھوڑیری

ہونا ہیتوں سو را اوڈیری

مت کر کوئی اگیان کڑیے

راج پیکا دن چار کڑیے

نا کھیڈو کھیڈ گزار کڑیے

نا ہو دیہلی کر کار کڑیے

گھر بار نا کر ویران کڑیے

ٹروت تا اوکھوں آویں گی

اُوتھے جا کے پچھوتاویں گی

کجھ اگدوں کر سمیاں کڑیے

او کنواری دوشیزہ اپنا سوت کاتنے پر دھیان کر

تیرے لیے سوت کاتنے کا چرخہ بنایا گیا ہے

کھیل کود میں اپنا جی نہ لگا

تو اب بالغ ہوگئی ہے

اس سے غافل نہ ہو

تجھ کو اپنے والدین کے گھر کی خوشیاں بہت کم ملتی ہیں

جنھیں تجھے کھیل کود میں نہ گنوا دینا چاہیے

تجھے کام کرنا چاہیے اور وقت ضائع نہ کرنا چاہیے

تجھے اپنے گھر کو خراب تنہائی کا گوشہ نہ بنانا چاہیے

جب تو دوسرے کے گھر جائے گی

تو کبھی لوٹ کر نہ آئے گی

اور پھر تو پشیمان ہوگی

اور اس پر افسوس کرے گی

بُلھے شاہ کے پیش نظر مقصد اعلیٰ خدا کا عرفان ہے جس کو صرف ایک مرشد کی رہنمائی سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس کے اشعار میں علامتی طور پر اپنے مُرشد کی تعظیم و تکریم اور محبت و عقیدت کا اظہار کیا گیا ہے۔ مرشد عنایت شاہ کو اس نے ہمیشہ یار (محبوب) پیارا (معشوق) ماہی (رانجھا) طبیب (معالج) وغیرہ کے ناموں سے خطاب کیا ہے۔ ان میں سے کچھ القاب یا صفات بُلھے شاہ نے خدا کے لیے بھی استعمال کی ہیں۔ یہ اس لیے کہ اعلیٰ ترین روحانی مقام پر پہنچ کر مُرشد اور خدا دونوں ایک ہو جاتے ہیں۔

بُلھے شاہ کے لیے چنڈال اور جھانا (دریائے چناب) عشق کی ایک علامت ہے۔ چونکہ ہیر رانجھا کا عشق اس کے کناروں پر ہوا تھا رانجھا کی طرح ڈھولا کا لفظ خدا کیلئے استعمال کیا گیا ہے مرشد کو کلال (مے فروش) بھی کہا گیا ہے۔ گھڑیال بجانے والے (گھڑیالی) کو بطور علامت وقت سے

تعبیر کیا ہے۔ طالب یعنی سادھک یا سالک کو 'بکرا' کہا گیا ہے۔ میم کا حرف احد کے ساتھ شامل کر کے نرگن ہستیٔ مطلق یعنی خدا یا عین کے اندر رکھا ہوا نقطہ محیط کل (سگن) کی علامت کو ظاہر کرتا ہے۔ احد میم کے اضافے کے ساتھ احمد یا نور المحمدیہ بن جاتا ہے۔ دنیا دار انسان کو سوداگر (تاجر) اور خود دنیا کو سرائے یعنی (CARAVAN SARAI OR INN) کہتے ہیں۔ موت ایک ایسے کوے کی علامت کے طور پر ہے جو کنواری کے ہاتھ کی بنی ہوئی روئی یا روئی کے دھاگے کو فوراً جھپٹ کرلے جاتا ہے۔ ہرن بھی موت کی ایک علامت کے طور پر ہے۔ جس طرح لفظ کاہن کو خدا کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ لفظ گوپی کا مطلب طالب اور محبت کی چنگاری پیدا کرنے والی مرلی کی آواز ہے۔ مُرشد ایک مُنکر کی علامت کے طور پر ہے جو کنواری (طالب) کے ہاتھ سے تیار کردہ روئی کے دھاگے کو لپیٹتا یا مانگی لگاتا ہے۔ اس طرح کی علامتیں ہمیں بُلھے شاہ کی شاعری میں ملتی ہیں۔

بُلھے شاہ کی منتخب کافیاں

(۱)

پایا ہے کچھ پایا ہے
میرے ست گُر الکھ لکھایا ہے۔ رہاؤ
کہوں بیَر پڑا کہوں بیلی ہے
کہوں مجنوں ہے کہوں لیلی ہے
کہوں آپ گرو کہوں چیل ہے

کہوں مہط کا ورتارا ہے
کہوں بنیاں ٹھاکر دوارا ہے
کہوں بیراگی جٹ دھارا ہے
کہوں شیخن بن بن آیا ہے

کہوں ترک مسلماں پڑھتے ہو
کہوں بھگت ہندو جپ کرتے ہو
کہوں گھور گھونگھٹ میں پڑتے ہو
ہر گھر گھر لاڈ لڈایا ہے

بُلھا میں تھیں بے محتاج ہوا
مہاراج ملیا میرا کاج ہوآ

درشن پیا کا مجھے علاج ہوا
آپ آپ میں آپ سمایا ہے

میں نے عرفانِ حق پالیا ہے میں نے کچھ عرفان الٰہی پالیا ہے
میرے سچے مرشد نے مجھے نا معلوم چیزوں کا علم دینے میں میری مدد کی ہے (وقفہ)
کہیں وہ دشمن ہے کہیں دوست ہے
کہیں مجنوں ہے کہیں لیلیٰ ہے
کہیں وہ خود مرشد ہے کہیں مرید ہے
اُس نے خود اپنی ہی طرف لیجانے والا راستہ بتایا ہے

کہیں مشہور ہے کہ وہ مسجد میں رہتا ہے
کہیں کہا جاتا ہے کہ وہ مندر میں بستا ہے
کہیں وہ جٹاؤں والے بیراگی کی طرح نظر آتا ہے
کہیں وہ شیخ بن کر ظاہر ہوتا ہے

کہیں مُترک مسلمان ہو کر مقدس کتابیں پڑھتا ہے
کہیں ہندو سادھو بن کر جپ تپ کرتا ہے
کہیں اس نے خود کو دبیز پردوں میں چھپا رکھا ہے
کہیں وہ ہر گھر میں اپنا پیار اور دُلار برساتا ہے

بُلھا کہتا ہے کہ میرا تمام تر بھروسہ اپنے قادرِ مطلق (محبوب) پر ہے
میں نے اسے پہچان لیا ہے اور میرا کام ہو گیا ہے
اُس کا دیدار ہی میرا علاج ہو گیا
وہ ہر ذی رُوح میں سمایا ہوا ہے

(۲)

بس کر جی ہُن بس کر جی
کائیں گل اساں نال ہس کر جی
تُوں مویاں نُوں مارنا ٹھکدا سئیں
پِھّدو وانگوں کُٹدا سئیں
گل کردے ساں گل گُھٹدا سئیں
ہُن تیر لائیو ای کس کر جی

تسی چھپدے سو اسی پکڑے ہو
تسی اُہے چھپن نوں تکڑے ہو
اساں ہردے اندر جکڑے ہو
ہُن کِدھر جاسونس کر جی

بُلھے شاہ تیرے اسی بردے ساں
تیرا مُکھ ویکھن نُوں مردے ساں
تیریاں عرضاں منتاں کردے ساں
ہُن بیٹھ پنجرے وچ کس کر جی

ختم کر اب اس کو ختم کر
مجھ سے مسکرا کے اب کچھ بات کر

تو نے کسی کو اذیت پہنچانے کے لیے چوٹ نہیں دی
تو ایک گیند کی طرح اس کو پکڑتا اور مارتا تھا
تو نے ہر بولتے کا گلا گھونٹ دیا تھا
اب تو نے بڑے وحشیانہ پن سے ایک تیر مارا ہے

تمہیں چھپنے کے باوجود میں نے جا پکڑا ہے
لیکن پھر بھی تم خود کو چھپانے میں بہت ماہر ہو
میں نے تمہیں اپنے دل کے اندر قید کر لیا ہے
اب تم کہاں بھاگ سکو گے

بلھا کہتا ہے کہ میں تیرا غلام تھا
میں تیرے دیدار کے لیے مر رہا تھا
میں تمہاری بڑی منت سماجت کرتا تھا
اب تم نہایت استواری کے ساتھ میرے تن بدن میں براجمان رہو

ہوئے نین نیناں دے بردے
درشن سائیاں کو ہاں توں کردے
یک پل دوڑن ذرا نہ ڈردے

لگ گیا میہوں تاں شرم سدھائی
(میں وچ) ہوئے میں رہی نا کائی
جب کی تم سیوں پریت لگائی — رہاؤ

ڈول ڈول عشق لگارے وجدے
عاشق دیکھ کے دل بجدے
تڑ تڑ تڑک گئے لڑ لجدے
تیں کوئی لالچ گھت بھرمائی

میں جاتا عشق سکھالا ہے
چوہ ندیاں وہن اُجالا ہے
کدی اگ بھڑکے کدی پالا ہے
نت برہوں جرأت لگائی

پیا بس کر ہوتی ہوئی
تیرا عشق میری دلجوئی
میرا تُدھ بن اور نا کوئی
اماں بابل بھین نہ بھائی

جب وصل وصال بنائیے گا
تب گونگے کا گڑ کھائیے گا
سر پیر نہ اپنا پائیے گا
میری سُدھ بُدھ رہی نہ کائی

تیں کارن جیسی ہوئے ہاں
تو دروازے بند کر سوئے ہاں
در دسویں آن کھلوتے ہاں
کدے من میری آشنائی

بُلھے شاہ میں تیں پہ وارے ہاں
تیرے دیکھن کے ونجارے ہاں

کجھ اسی بھی تینوں پیارے ہاں
کی میہوں گھول گھمائی

میری آنکھیں تیری آنکھوں کی غلام ہوگئی ہیں
جو سینکڑوں میل کی دوری سے تیرا دیدار کرسکتی ہیں
وہ ہر لمحہ بے خوفی کے ساتھ دوڑتی رہتی ہیں

محبت کی فراوانی کے ساتھ سب شرم وحجاب جاتا رہا ہے
اب میں (تکبّر) کا شائبہ بھی باقی نہیں رہا
جب سے میں نے تم سے محبت کی (وقفہ)

محبت کے نقّارے بج رہے ہیں
انہیں سُن سُن کر عاشق ان کے بجنے کی جگہ بھاگ رہے ہیں
شرم وحجاب کے سارے دھاگے ٹوٹ گئے ہیں
تم نے اب مجھے بہلا پھُسلا لیا ہے

میں نے سوچا تھا کہ عشق بہت آسان مشغلہ ہے
لیکن یہ چار چشموں کی ایک اونچی دھار تھی
کبھی یہ آگ کی طرح بھڑکتا ہے اور کبھی سرد ہو جاتا ہے
فرقت آتش زندگانی کا سا کام کرتی ہے۔

او محبوب! اب ختم بھی کر، مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے
تیرا عشق میری دلبستگی کی بات ہے
تیرے علاوہ میرا اور کوئی نہیں ہے
نہ اماں، نہ ابا، نہ بہن نہ بھائی

جب وصل کا وقت آئے گا
تب رُوحانی مسرت ناقابلِ اظہار ہوگی
بیخودی و بیہوشی کی کیفیت طاری ہو جائے گی
میری سُدھ بُدھ سب بسر جائے گی

میں تیرے سبب جیسی ہو گیا ہوں
میں نے سونے کے لیے نو دروازے بند کر لیے ہیں
میں دسویں دروازے پر کھڑا ہوں
براہِ مہربانی میری محبت قبول کرے

بُلھا کہتا ہے میرے محبوب! میں تجھ پر قربان ہوں
میں تیرے دیدار کی تمنا کر رہا ہوں
اگر میں تجھ کو پیارا لگتا ہوں تو میری محبت کا جواب دے
یا یہ محبت میری ہی طرف سے ہے؟

(۴)

بِلی جِت گھر تیرا پھیرا ہوا
اُوجل بل مالی ڈھیر ہوا
تن راکھ اُڈی تاں سیر ہوا
عنقا بیٹھے آیا ہیں
توں آیا ہیں میں پایا ہیں ۔۔۔ رہاؤ

حکری ہر کلو تر دیتوں
جو نسب بھتوں ہتھ دیکھوای
ابراہیم چِکھا وِچ پائیوای
او مینوں کیائے آیا ہیں

اِکنا دے پوش لہائی دے
اِک آریاں نال چِھوائی دے
اک سولی چائے دوائی دے
کرکِس گل دا سدھرائیاں ہیں

بُلھے شاہ دے کارن کرن کر
تن بھٹی اِت من آہرن کر

وچ دل دالوہا ماون کر
لوہار اکّن اُلکائیاں ہیں

او دوست! جس گھر میں تیرا داخلہ ہوا
وہ جل کر راکھ کا ڈھیر ہو گیا
تب تو مطمئن ہوا جب راکھ اُڑ گئی
او عشق! تو مجھ میں در آیا ہے
تو آ گیا ہے اور میں نے تجھ کو اپنا لیا ہے ــــ (وقفہ)

تو نے ذکریا کے سر پر آرا چلایا
تو یوسفؑ کو بہت سی دُکانوں پر بیچے جانے کا کارن بنا
تو نے ابراہیمؑ کو آگ میں ڈال دیا
اب تو نے میرے لیے کیا چھوڑا ہے

کچھ ہیں جن کی کھال کھینچ لی گئی تھی
کچھ ہیں جن پر آرے چلائے گئے تھے
کچھ ہیں جن کو سولی پر چڑھا دیا گیا تھا
اب تیرے پاس میرے لیے کیا رہ گیا ہے

بلھا کہتا ہے کہ محبوب حقیقی کے تعلق کے سبب
تن بھٹی اور دماغ سنداں ہو گیا ہے
جن پر عشق کا لوہا (ہتھوڑا) بجتا ہے
پھر لوہا آگ میں جل کر پگھل گیا ہے

۵

دلبر سنبھل کے نیہہ لائیں
پچھوں پچھوتا وہیں گا
اوتھے عشق زلیخا ہے
اوتھے عاشق تڑفن سائی
اوتھے مجنوں کرداں ہائی
اوتھے توں کیا لیا ویں گا

جاہی بے جنا پھیر
اوتھے بے پرواہیاں ڈھیر
اوتھے دل کھلوندے شیر
اوتھے توں بھی چھلیا جاویں گا

کلالاں دا گھر یاسے
اوتھے آون مست پیاسے
بھر بھر پین پیالے خاصے
اوتھے توں بھی جیو للچاویں گا

بُلھا غیر شرع نہ ہوئے
سُکھ دی نیند ر بھر کر سوئے
انا الحق نا مکھوں بکوئے
چڑھ سولی ڈھولا گاویں گا

او عاشق! محبت میں ذرا سنبھل کر رہنا
ورنہ بعد میں تجھ کو پچھتانا پڑے گا
ادھر زلیخا کا عشق ہے
وہاں سینکڑوں عاشق دردمیں تڑپتے ہیں
ادھر مجنوں چیخ چلّا رہا ہے
تو وہاں سے کیا پائے گا

جا! اگر تو بہت زیادہ ثابت قدم ہے
وہاں بہت سی بے پرواہیاں ہیں
وہاں شیر خوف سے کانپتے ہیں
وہاں تو بھی فریب کھا جائے گا

مے فروشوں کا گھر پاس ہی ہے
جہاں مست اور پیاسے آتے ہیں
لبالب بھر کے پیالے پیتے ہیں
وہاں تیرا بھی جی للچا جائے گا

بُلھا! شریعت سے الگ ہٹ کر مت چل
ہمیشہ سُکھ کی نیند سو

اپنی زبان سے انا الحق (میں خدا ہوں) نہ کہہ
ورنہ تو محبت کا گیت گاتا ہوا سُولی پر چڑھا دیا جائے گا

(۶)

ہُن کس تھیں آپ چھپائی دا
منصور بھی تیتھے آیا ہے
تیں سُولی پکڑ چڑھایا ہے
تیں خوف نہ کیتو سائیں دا

کِتوں شیخ مشائخ ہوناہیں
کِتوں اُدیانی بیٹھا روناہیں
تیرا انت نہ کِتوں پائیں دا

بُلھے نلوں چُلھا چنگا
جس تے تام پکائی دا
رل فقیراں مصلت کیتی
بھورا بھورا پائیں دا

تم کس سے اپنے خود کو چھپاتے ہو
منصور بھی تم تک آیا تھا
اور تم نے اس کو سُولی پر چڑھا دیا
تم کو خدا کا خوف کیوں نہ آیا

کبھی تم شیخ کے روپ میں ظاہر ہوتے ہو
کبھی تنہائی میں بیٹھ کر روتے ہو
کوئی بھی تم کو جان پہچان نہ پایا

بُلھے سے تو اس کا چولہا ہی بہتر ہے
جس پر روٹی پکائی جاتی ہے
سب فقیر مل بیٹھ کر ایک فیصلے پر پہنچے
اور آپس میں بھورے ٹکڑے بانٹ لیے

۷

کی کردا کی کردا وہ
پچھو تو دلبر کی کردا وہ ــــ رہاؤ
اِک سے گھر وِچ وسدیاں رسدیاں
نہیں ہندا اں وِچ پرداں وہ

وحدت دا دریا وُستر انا
کوئی ڈبدا کوئی تردا وہ
بُلھا شاہ نوں آن ملاوو
محرم ہے اس گھر دا وہ

وہ کیا کرتا ہے وہ کیا کرتا ہے
محبوب سے دریافت کرو وہ کیا کرتا ہے ــــ (وقفہ)
اسی گھر میں رہتے ہوئے
پردہ پسندیدہ اور قابلِ قبول نہیں ہے

وحدت کا دریا اپنے پورے بہاؤ میں ہے
کوئی ڈوب گیا اور کوئی تیرتا ہے
بُلھا کی محبوبِ حقیقی سے ملاقات قریب ہی ہے
وہ اس گھر کے رازوں سے واقف ہے۔

(۸)

میرے بُکّل دے وِچ چور
سادھو کس نُوں کُوک سناواں
میری بُکّل دے وِچ چُور
کِتے رام داس کِتے فتح محمد
ایہو قدیمی شور
مسلمان سلوے توں چڑدے
ہندو چڑدے گور
مُک گئے سب جھگڑے جھیڑے
نکل گیا کوئی ہور
سادھو کس نُوں کُوک سناواں
میری بُکّل دے وِچ چور

جس ڈھونڈیاں تِس پایو ناہیں
جھُر جھُر ہویا مور
آپ صاحب جس نوں سنبھال لائے
میںنوں اُسے دی گت زور
جیہڑا لیکھ متھے دا لکھیا
کون کرے بھن توڑ

سادھو کس نوں کوک سناواں
میری بکل دے وچ چور

پیر پیراں بغداد اساں دا
مرشد تخت لاہور
م ہراسی سبھ اگو کوڑے
آپ گڈی آپ ڈور
تسی پکڑ لہویں دسناں ہاں
بلھا شاہ دا چغل خور
سادھو کس نوں کوک سناواں
میری بکل دے وچ چور

میرے دامن میں کوئی چور آن چھپا ہوا
او سادھو! میں اسے کیا نام دوں
میرے دامن میں کوئی چور آن چھپا ہے
کہیں وہ رام داس ہے کہیں فتح محمد ہے
قدیم زمانے سے یہی شور چلا آرہا ہے
مسلمان مردوں کو جلانے سے نفرت کرتے ہیں
ہندو قبروں میں دفنانے سے چڑتے ہیں
اب سارے لڑائی جھگڑے ختم ہو گئے ہیں
اب کوئی اور ظاہر ہوگیا ہے
او سادھو! مجھے اب اس کا کیا نام بتانا چاہیے
میرے دامن میں کوئی چور آن چھپا ہے

جس نے اُسے تلاش کیا اُس نے نہ پایا
وہ سُوکھ کر مور کی طرح دُبلا پتلا ہو گیا ہے
جس کسی کو بھی قادرِ مطلق تلاش کر لیتا ہے پا لیتا ہے
میں اُسی کے سبب خود کو توانا پاتا ہوں
جو کچھ بھی نصیب میں لکھ دیا گیا ہے
اُس کو کون بدل سکتا ہے
او سادھو! میں کس کا نام لُوں
میرے دامن میں کوئی چور آن چھُپا ہے

میرا روحانی پیر بغداد میں ہے
میرا مُرشد لاہور میں ہے
وہ مجھ سے یوں جڑے ہوئے ہیں
جیسے گُڈی اور ڈور
میں تم سے کہوں کہ اُسے جلد پکڑ لو
بُلھے شاہ کا چُغل خور کون ہے؟
او سادھو! میں کس کا نام پُکاروں
میرے دامن میں کون چور آن چھُپا ہے

٩

رانجھا جوگیڑا بن آیا نی
واہ واہ جوگیڑا بن آیا نی
اس جوگی دے نین کٹورے
بازاں وانگوں لیندے ڈورے
مُکھ ویکھیاں دُکھ جاون جھوڑے
انہاں اکھیاں نے لال لکھایا نی
رانجھا جوگیڑا بن آیا نی

اس جوگی دی کی دے نشانی
کن وِچ مُندراں گل وِچ گانی
صورت اس دی یوسف ثانی
اُس الفوں احد بنایا نی
رانجھا جوگیڑا بن آیا نی

رانجھا جوگی تے میں جوگیانی
اُس دی خاطر بھر سا پانی
ایویں تہ پچھلی عمر وہانی
ہُن اس مینوں بھرمایا نی
رانجھا جوگیڑا بن آیا نی

بُلھا شاہ دی ہن گت پائی
بیت پرانی مُڑ مچائی
ایہہ گل کیکر چھپے چھپائی
ہُن تخت ہزاریوں دھائی
رانجھا جوگیڑا بن آیا نی

رانجھا جوگی بن کر آگیا ہے
واہ واہ رانجھا جوگی بن کر آگیا ہے
اس جوگی کی آنکھیں کٹورے کی طرح ہیں
جن میں لیلائیں زخمی ہو کر غوطے کھاتی ہیں
جب وہ نگاہ کے سامنے آتا ہے تو سب دکھ دور ہو جاتے ہیں
میری آنکھوں نے محبوب کا عرفان پا لیا ہے
رانجھا جوگی بن کر آگیا ہے

اس جوگی کی نشانی کیا ہے؟
اُس کے کانوں میں بالیاں اور گردن میں رنگین فیتہ پڑا ہے
شکل سے وہ یوسف ثانی نظر آتا ہے
اُس نے 'الف' ہو کر 'احد' کی تخلیق کی ہے
رانجھا جوگی کے رُوپ میں ظاہر ہوا ہے
رانجھا ایک جوگی ہے اور میں اُس کی جوگن ہوں
میں دل کے ساتھ اُس کی خدمت کروں گی
میری پچھلی زندگی سب بیکار گزر گئی
اب اُس نے مجھے بہلایا پھسلایا ہے
رانجھا جوگی کے روپ میں آگیا ہے

بُلھا کہتا ہے کہ اب میں نے محبوبِ حقیقی کو جان لیا ہے
پُرانی محبت نے پھر اپنا سر اُٹھا لیا ہے
اس حقیقت کو کیسے چھپایا جا سکتا ہے
وہ اب نہایت آہستہ روی کے ساتھ تخت ہزارا سے آگیا ہے
رانجھا جوگی بن کر آگیا ہے

(۱۰)

گھڑیال دیؤو نکال نی
اج پی گھر آیا لال
مینوں اپنی خبر نہ کائی
کیا جاناں میں کیتے گنوائی
ایہہ گل کیکوں چھپل چھپائی
ہُن ہویا فضل کمال
گھڑیال دیؤو نکال

گھڑی گھڑی گھڑیال وجاوے
رین وصل دی کیوں گھٹاوے
میرے من دی بات جو پاوے
ہتھوں چاسٹے گھڑیال
گھڑیال دیؤو نکال

ان حد باجا بجے شہانا
مطرب، سُغراں، تان، ترانہ
نماز روزہ بُھس گیا دوگانا
مد پیالے دین کلال

گھڑیالی دیؤو نکال

ٹونے کامن کرد سویرے
جادوگر آدن وڈے وڈیرے
کویں کویں دس آیا میرے
لکھ برس رہی ہوری نال
گھڑیالی دیؤو نکال

سائیں مُکھ ویکھن دے عجب نظارے
دُکھ دہلت گئے جو پاس پیارے
چنگی رات وڈھی کو ــــ ے کری پسارے
دن اگے دھرو دلیوال
گھڑیائی دیؤو نکال

بُلھا شاہ دی سیج پیاری
تاری سوتارن ہارے تاری
کونے کوے ہن آئی آداری
مینوں وچھن ہویا محال
گھڑیالی دیؤو نکال

گھڑیالی کو نکال کر باہر کرو
آج میرا محبوب گھر آگیا ہے
مجھے اپنی کوئی خبر نہیں ہے
مجھے کچھ پتہ نہیں کہ یہ کہاں کھو گئی ہے
اس حقیقت کو کیسے چھپایا جا سکتا ہے

اب مجھ پر خدا کا فضل ہو گیا ہے
گھڑیالی کو نکال باہر کرو

گھڑیالی گھڑی گھڑی گھنٹہ بجاتا ہے
یہ وصل کی رات کیوں گھٹائے جاتا ہے
یہ اگر میرے دل کی بات پا رہا ہے
تو اسے اپنے ہاتھ سے گھنٹہ پھینک دینا چاہیے
گھڑیالی کو باہر نکال دو

شاہانہ باجا لگا تار بجتا ہی جاتا ہے
ماہر موسیقاروں نے اس کے سُروں کو سجایا ہے
نماز روزہ سب نے بھلا دیا ہے
بھر بھر کے شراب کے پیالے مے فروش دے رہے ہیں
گھڑیالی کو باہر نکال دو

جادو ٹونا شروع کرو اور منتر پڑھو
بڑے سے بڑے جادوگروں کو آنے دو
بڑی محنت کے بعد میں نے ان کو قابو میں کیا ہے
لاکھوں برس دوسروں کے ہمراہ رہنے کے بعد
گھڑیالی کو باہر نکال دو

محبوب حقیقی کے رُخِ روشن کے عجب نظارے دیکھے ہیں
محبوب حقیقی کی موجودگی کی وجہ سے سارے غم دور ہو گئے ہیں
یہ گذرتی ہوئی اچھی رات کیسے بڑھائی جا سکتی ہے

دن نکلنے سے پہلے اس کے آگے دیوار کھڑی کردو
گھڑیال کو نکال باہر کرو

بُلھا کہتا ہے کہ محبوبِ حقیقی کی سیج بڑی پُر لطف ہے
کھویّا نے مجھے کنارے پر لگا دیا ہے
میری باری ایک طویل مدت کے بعد آئی ہے
مجھے تیری جدائی بہت ہی سخت و دشوار ہوگی
گھڑیال کو نکال باہر کرو

(۱۱)

کی کردا ہُن کی کردا
کسی کہو کہاں دلبر کی کردا
اس دے گھر وچ وسدیاں رسدیاں نہیں بنداں ہُن پردا
وچ مسیت نماز گزارے، بُت خانے جا سجدا
آپ اکو کئیں لکھ گھراں دے مالک ہے گھر گھردا
جت ول ویکھاں تت ول توں ہی ہر اک دا سنگ کردا
موسیٰ تے پھراون (فرعون) بنا کے دو ہواں کیونکر لڑدا
حاضر ناظر خود نویس ہے دوزخ کس نوں کھڑدا
نازک بات ہے کیوں کہندا نا کہہ سکدا نا جردا
واہ واہ وطن کہی دا ایہو اک دبیدا اک سڑدا
وحدت دا دریاؤ سچا اُدھے دسے سبھ کو تردا
اِت ول آپے اُت ول آپے آپے صاحب آپے بردا
بُلھا شاہ دا عشق بگھیلا، رت پیندا گوشت چردا

وہ کیا کرتا ہے اب وہ کیا کرتا ہے
مجھے بتاؤ کہ دلبر کیا کرتا ہے
ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے مناسب نہیں کہ پردہ کیا جائے
وہ مسجد میں جاکر نماز پڑھتا ہے اور مندر میں جاکر ماتھا ٹیکتا ہے
وہ ایک ہے اور گھر کئی لاکھ ہیں وہ ہر گھر کا مالک ہے
جہاں کہیں دیکھتا ہوں تو وہیں، ہر ایک کے ساتھ موجود ہے
تو نے موسیٰ وفرعون کو پیدا کیا اور دو ہو کر خود لڑ پڑا
تو ہر جگہ موجود ہے اور فیصلہ خود کرتا ہے کہ کس کو دوزخ میں لیجائے
یہ نازک بات ہے مجھے اسے کیوں نہ کہنا چاہیے
وہ حیران کن زمین ہے جہاں ایک دبایا اور ایک جلایا جاتا ہے
اس وحدت وصداقت کے دریا میں ہر ایک تیرتا نظر آتا ہے
وہ ادھر ہے وہ اُدھر بھی ہے، وہی آقا ہے وہی خدمتگار ہے
بُلھا! مرشد کا عشق ایک شیر ہے جو خون پیتا
اور گوشت کھاتا ہے

۱۲

میتُوں کی ہویا ہُن میتھوں گئی گواتی میں
کیوں کملی آکھے لوکاں میتُوں کی ہویا ہے
میں وِچ ویکھاں تے میں نہیں بندی، میں وِچ دستا ایں تیں
سرتے پیروں تک بھی توں ہی، اندر باہر ہیں
اِک یار اک ارار سُیندا اک بیری اک نین
جھٹ پائے اڑورُوں پردل نا بیری نا نین
منصُور پیارے کہا انا الحق کہو کہائیاں کیں
بُلھے شاہ اُسے دا عاشق، اپنا آپ ونجایا جیں

مجھے کیا ہو گیا ہے میرا وقار خود میں گم ہو گیا ہے

لوگ مجھے کیوں دیوانہ کہتے ہیں مجھے کیا ہو گیا ہے
جب میں اپنے اندر جھانکتا ہوں مجھ میں 'میں' نہیں ہے
تم مجھ میں اندر اور باہر سب جگہ موجود ہو
میں سنتا ہوں کہ اس کنارے اور اس پار ناؤ ایک ہے چشمہ ایک ہے
یہاں کوئی ناؤ نہیں کوئی چشمہ نہیں
پیارا منصور کہتا ہے انا الحق (میں خدا ہوں) اس بات کے
کہنے کا کون سبب بنا
بُلھے شاہ کہتا ہے کہ میں اسی خدا کا عاشق ہوں میں نے اپنی
انا ختم کر دی ہے

(۱۳)

پردا کس توں راکھی دا
کیوں اوہلے بہہ بہہ جھاتکی دا
پہلے آپے ساجن ساجھی دا
ہُن دسنا ایں سبق غازی دا
ہُن آیا آپ نظارے نوں
وچ لیلیٰ بن بن جھاتکی دا
شاہ شمس دی کھل لہایو
منصور نوں چا سولی دوایو
ذکری سر کلوتر دھرایو
کی لکھیا رہ گیا باقی دا!

کُن کہیا فیکون کہایا
بیچونی دا چون بنائیے
خاطر تیری جگت بنایا
سر پر چھتر لولاکی دا

ہُن ساڈی ول دہایا ہیں
نہ رہندا ں چھپیا چھپایا ہیں
کتے بُلھا نام دھرایا ہیں
وچ اولہار کھیا خاکی دا

تم کس سے اپنا راز چھپاتے ہو
تم پردے کے پیچھے سے کیوں جھانکتے ہو
او خدا پہلے تم نے مجھے پیدا کیا!
تم کیوں اب مجھے نماز پڑھنے کا سبق دیتے ہو
تم آپ اپنا جلوہ دکھانے کے لیے آئے ہو
اور لیلیٰ بن بن کر جھانکتے ہو

تم نے شاہ شمس کی کھال کھنچوائی
منصور کو سولی پر چڑھایا
ذکریا کو آرے سے چروایا
اب اور کیا لکھا ہوا باقی رہ گیا ہے

تم نے کُن کہا اور دنیا وجود میں آگئی
تم ناقابلِ اظہار کا اظہار بن گئے
تمہاری خاطر سے دنیا بنائی گئی
تمہارے سر پر آسمان لولاک کا بن گیا

اب تم ہمارے پاس آ گئے ہو
اور اب صاف ظاہر ہو گئے ہو

کہیں تم نے بُلھا نام رکھ لیا ہے
اور درمیان میں صرف خاک کا پردہ رہ گیا ہے

(۱۴)

عشق دی نویوں نویں بہار
پھونک مصلّیٰ بھن سٹ لوٹا
نا پھڑ تسبیح، کاسا، لوٹا
عالم کہندا دے دے ہوکا
ترک حلالوں کھا مُردار

عمر گنوائی وِچ مسیتی
اندر بھریا نال پلیتی
کدے نماز وحدت نا کیتی
ہُن کیوں کرنا ایں دھاڑو دھاڑ

جاں میں سبق عشق دا پڑھیا
مسجد کولوں جیوڑا ڈریا
بھج بھج ٹھاکر دوارے وڑیا
گھر وِچ پایا محرم یار

جاں میں رمز عشق دی پائی
مینا طوطی مار گنوائی
اندر باہر ہوئی صفائی
جت ول ویکھا یار دیار

ہیر رانجھا دے ہو گئے میلے
بھُلی ہیر ڈھونڈیندی بیلے
رانجھا یار بغل وچ کھیلے
مینوں سدھ بدھ رہی نہ سار

وید قرآناں پڑھ پڑھ تھکے
سجدے کردیاں گھس گئے متھے
نہ رب تیرتھ نہ رب مکّے
جن پایا تن نور انوار

عشق بھُلایا سجدہ تیرا
ہُن کیوں ایویں پاویں جھیڑا
بُلھا ہور رہو چپ چپیرا
مکّی سگلی کوک پُکار

عشق ہمیشہ نیا اور تازہ رہتا ہے
مُصلّیٰ جلا ڈال اور لوٹا توڑ دے
پیالہ، سوٹا، اور تسبیح نہ پکڑ
عالم اسے اپنی تیز آواز میں کہتا ہے

صحیح (حلال) کو چھوڑ دے ممنوعہ (حرام) کو قبول کرے
تو نے مسجد میں عمر برباد کر ڈالی
تیرا باطن برائیوں سے بھرا ہوا ہے
تو نے کبھی نماز وحدت نہیں پڑھی
اب تو افسوس کیوں کرتا ہے

جب میں نے عشق کا سبق پڑھا
میں نے مسجد میں اپنا دل رکھ دیا
میں مندر کی طرف بھاگ بھاگ کر گیا
میں نے پھر یہ دیکھا کہ یار تو میرے گھر کے اندر ہے

جب میں عشق کا رمز شناس ہوا
تو 'میں' اور 'تو' ٹوٹ کر تباہ ہو گئے
میں اندر باہر سے پاک ہو گیا
میں نے جس طرف دیکھا خدا ہی کو پایا

ہیر اور رانجھا کا ملن ہو گیا ہے
ہیر اُس (خدا) کو ڈھونڈنے کے لیے دُور دُور نکل گئی
لیکن محبوب رانجھا اُس کی بغل میں نکلا
میں اپنے ہوش و حواس میں نہ رہا

ہم وید اور قرآن پڑھ پڑھ کے تھک گئے
سجدے کر کر کے ہمارے ماتھے گھس گئے
نہ تو خدا مقدس مقامات میں ہے نہ کعبے میں ہے
جنھوں نے عرفانِ خدا پا لیا وہ نور و انوار سے معمور ہو گئے

عشق نے مجھے سجدے کرنا بھلا دیا ہے
تم اب آپس میں جھگڑا کیوں کرتے ہو
بُلھا کہتا ہے خاموش رہو
سب چیخ و پکار کا خاتمہ ہو چکا ہے

(۱۵)

ماٹی کدم کریندی یار
واہ واہ ماٹی دی گلزار
ماٹی گھوڑا ماٹی جوڑا ماٹی دا اسوار
ماٹی ماٹی نوں دوڑاوے ماٹی دا کھڑکار
ماٹی ماٹی نوں مارن لگی ماٹی دے ہتھیار
جس ماٹی پر بوہتی ماٹی، سو ماٹی ہنکار
ماٹی باغ، بغیچہ ماٹی، ماٹی دی گلزار
ماٹی ماٹی نوں ویکھن آئی ماٹی دی بہار
ہس کھید پھر ماٹی ہووے، پیندی پاں پسار
بُلھا ایہہ اسے بُجھارت بُجھیں تاں لہہ سروں بھوئیں مار

اے دوست! زمین پر فساد برپا ہو رہا ہے
زمین کا باغ واقعی قابلِ تعریف ہے
مٹی کا گھوڑا، مٹی کی پوشاک اور مٹی کا سوار ہے
مٹی مٹی کو دوڑا رہی ہے مٹی ہی کی آواز ہے
مٹی مٹی کو مٹی کے ہتھیاروں سے مار رہی ہے
مٹی مٹی پر چڑھ کر مٹی پر مغرور ہو رہی ہے

چھوٹے بڑے باغ بغیچے مٹی کے بنے ہوئے ہیں
مٹی مٹی کو اور اس کی شگفتگی کو دیکھنے آئی ہوئی ہے
مٹی عیش و آرام کے بعد مٹی ہو جاتی ہے اور مُنہ کے بل گرتی ہے
بُلھا کہتا ہے کہ اس کے حل کے لیے اپنا سارا غرور سر سے اُتار دو

(۱۶)

مینُوں کون پچھانے، میں کُجھ ہو گئی ہور نی
ہادی مینُوں سبق پڑھایا
اُوتھے غیر نہ آیا جایا
مُطلق ذات جمال دکھایا
وحدت پایا زور نی
اوّل ہو کے لامکانی
ظاہر باطن دِسدا جانی
رہی نہ میری نام نشانی
مٹ گیا جھگڑا شور نی

پیارے آپ جمال وکھالی
ہوئے قلندر رہوئے موالی
ہنساں دی ہُن ویکھ کے چال
بُھل گئی کاگاں تور نی

مجھے کون پہچانے میرا رُوپ بدل گیا ہے
میرے ہدایت دینے والے نے مجھے سبق پڑھایا
وہاں نہ کوئی اجنبی آیا نہ گیا

صرف خدا نے اپنے نور و جمال کی نمائش کی
خدا نے اپنی بھرپور وحدت کا مظاہرہ کیا
وہ اوّل ہے لیکن اُس کا کوئی مسکن نہیں
وہ ظاہر و باطن میں دکھائی دیتا ہے
میرے نام و نشان سب معدُوم ہو گئے ہیں
اور تمام شور و غل اور جھگڑے مٹ گئے ہیں
قادرِ مطلق (خدائے واحد) نے خود ہی اپنا جمال دکھایا
میں اُس ذاتِ واحد کا مست و سرشار فقیر ہو گیا
میں ہنسوں کی چال کا انداز دیکھتے ہوئے
کوّوں کی فطرت بھول گیا۔

۱۷

مُرلی باج اُٹھی انگھاتاں
مینوں بھُل گیاں سبھ باتاں
لگ گئے ان حد بان نیارے
چھُٹ گئے دنیا دے کوڑ پسارے
اسی مکھ ویکھن دے ونجارے
دُوا آ بھُل گیاں سبھ باتاں
اساں ہُن چنچل مرگ پھاہیا
اوسے مینوں بانہہ بہایا
عرف دُگانہ اسے پڑھایا
رہ گیاں دو چار رکاتاں

بلھے شاہ مَیں تدبر آئی
جد دی مُرلی کاہن بجائی
بَوری ہوئی تے تیں ول دھائی
کھوجی کت ول دست براتاں

خدائے واحد کی مُرلی اچانک بج اٹھی
میں سب باتیں بھول گیا
مجھے دان حد' یعنی خدا کی موسیقی کے عجیب تیر لگے
میں دنیا کی فضول باتوں سے آزاد ہو گیا
میں تو اُس ذات واحد کا روئے انور دیکھنے کا کاروبار کرتا ہوں
میں دوسری تمام باتیں بھول گیا ہوں
اب میں نے شوخ ہرن کو اپنے جال میں پھنسا لیا ہے
جس نے میری ساری توجہ اپنی طرف مرکوز کر لی تھی
اُس نے مجھے عبادت کے سارے منتر پڑھائے
جن کا صرف ایک حصّہ پڑھنے سے رہ گیا ہے
بُلھا کہتا ہے تب میں الگ تھلگ ہو گیا تھا
جب مُرشد نے مرلی بجائی
میں پاگل ہو کر اُس کی طرف دوڑا
مجھے بتاؤ کہ کس راہ میں وہ اپنی محبت کی بارش کرے گا

۱۸

اساں بھیت سجن دے پائے
اُلٹے ہور زمانے آئے
آپنیاں وِچ الفت ناہیں
کیا چاچے کیا تائے
پیو پُتراں اتفاق نہ کائی
دھیاں نال نہ مائی
سچیاں نوں ہُن ملدے دھکے
جھوٹے کول بہائے
عراقیاں نوں چابک پوندے
گدھو خود کھوائے
اگلے جا بنگالے بیٹھے
پچھلیاں فرش وچھائے
بُلھا جنہاں حکم حضوروں آندا
تنہاں نوں کون ہٹائے

مجھے قادر مطلق کے راز معلوم ہو گئے ہیں
اُلٹے زمانے آ گئے ہیں
اب قریب کے رشتہ داروں میں محبت نہیں رہی
کیا چاچا ہوں کیا تایا کسی میں الفت نہیں رہی
باپ بیٹوں میں اتفاق ختم ہو گیا ہے

بیٹیوں اور ماں میں پیار باقی نہیں رہا
سچوں کو اب دھکے کھانے پڑتے ہیں
اور جھوٹوں کو قربت ملتی ہے
اچھی نسل کے گھوڑوں پر چابک پڑتے ہیں
گدھے گیہوں کی بالیں چرتے ہیں
پہلے کے لوگ بنگال جا بسے ہیں
اور بعد کے لوگوں نے اپنے خیمے گاڑ لیے ہیں
بلھا! جن کو خدا تعالیٰ سے حکم آگیا ہے
کس کی ہمت کہ ان کو ہٹائے

۱۹

کجھ کت کُڑے، نہ وت کُڑے
چھلی لاہ بھروتے گھت کُڑے
جے پُونی پُونی کتیں گی
تاں ننگی مول نہ وتیں گی
سئی وڑھیاں دے نچے کتے گی
تاں کاگ ماری کا جھت کُڑے

وِچ غفلت جو تیں دن جالے
کتّے کے کجھ نہ لیو سنبھالے
باہجوں گُن شاہ اپنے نالے
تیری کیونکر ہوسی گت کُڑے

جے تاج وہونی جاویں گی
تاں سہالیہ ناکسے بھاویں گی
اُودستے شاہ نوں کِوے رِجھاویں گی

کُجھ لے فقراں دی مَتّ کُڑے

ماں پیو تیرے گنڈھی پائیاں
اجے نا تینوں خبراں آئیاں
دن تھوڑے تے چانگائیاں
نا آسیں پیکے وتّ کُڑے

تیرے نال دیاں واج رنگائے نی
اُنہاں سوہے سالو پائے نی
توں اُٹھے پیر کیوں چائے نی
اوتھے جائیں تاں لگےّ تتّ کُڑے

بُلھا شاہ گھر اپنے آوے
چوڑا بیڑا سبھ سُہاوے
گُن ہوسی تاں گل لاوے
نہیں روسیں نینی رتّ کُڑے

او کنواری (مجرّد) کچھ بُن لے کات لے اب بے مقصد و بے کار نہ پھر
ایک لچھّا دھاگا بن کر اس کو ٹوکری میں ڈال دے
اگر تو چھوٹے لچھّے (سُوت کے گولے) بُنے گی.
تو برہنہ نہ رہ پائے گی
اگر تو ایک سو برس کے لیے بنے گی
تو کوّا سارے دھاگے کھینچ کر لے جائے گا

وہ دن جو غفلت میں تو نے گنوا دیئے
جب تو نے نہ تو کچھ کیا اور نہ کچھ سنبھال کے رکھا
اور قادر مطلق کے سامنے گنوں کے بغیر گئی
تو خود کو اچھا کیسے ثابت کر پائے گی

اگر تو جہیز کے بغیر جائے گی
تجھے کوئی پسند نہ کرے گا
تو وہاں اپنے خدا کو کیسے رجھا سکے گی
کچھ فقیروں کا مشورہ لے لے

تیرے ماں باپ نے تیری شادی کی کچھ گانٹھیں باندھی ہیں
لیکن تو ابھی تک بے خبر ہے
تیری منگنی ہو گئی ہے اور کچھ روز باقی رہ گئے ہیں
تو اپنے والدین کے گھر اب واپس نہ آپائے گی

تیری سہیلیوں کو رنگ برنگا جہیز ملا ہے
وہ ہلکے لال رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھیں
تو الٹی اداکاری کیوں کر رہی ہے
تو غمگین ہو جائے گی جب وہاں پہنچے گی

بلہا کہتا ہے جب محبوب گھر آتا ہے
شادی کے جوڑے بڑے حسین و رنگین نظر آتے ہیں
اگر تو صفات رکھتی ہے تو مالک تجھے گلے سے لگائے گا
ورنہ تو خون کے آنسو روئے گی

۲۰

ہک 'الف' پڑھو چھٹکارا ہے
اس الفوں 'دو' 'تین' 'چار' ہوئے
پھر 'لکھ' 'کروڑ' 'ہزار' ہوئے
پھر اوتھوں بے شمار ہوئے
ہک الف دا نکتہ نیارا ہے

کیوں پڑھنا ایں گڈ کتاباں دی
سر چائیں پنڈ عذاباں دی
ہُن ہوئی اَشکل جلاداں دی
اگے پینڈا مشکل بھارا ہے

بن حافظ حفظ قرآن کرے
پڑھ پڑھ کے صاف زبان کرے
پھر نعمت وِچ دھیان کرے
من پھردا جیوں ہلکارا ہے

بُلھا بی بوہڑ دا بویا سی
اوہ برچھ وڈا چا ہویا سی
جد برچھ اوہ فانی ہویا سی
پھر رہ گیا بی اکارہ ہے

ایک الف کے پڑھنے سے تجھے نجات مل جائے گی
اس ایک الف سے دو تین چار پیدا ہوئے
پھر لاکھ کروڑ، ہزار ہو گئے
پھر وہ بے شمار ہو گئے
ایک الف کا نقطہ نہایت انوکھا اور نرالا ہے

تو گاڑی بھری کتابیں کیوں پڑھتا ہے
تو اپنے سر پر غموں کا بوجھ اٹھائے لیے جا رہا ہے
تو نے ایک سخت جلاد کی شکل اختیار کر لی ہے
تجھ کو ایک دشوار و سخت ترین فاصلہ طے کرنے کے لیے سفر کرنا ہے

تو حافظ بننے کے لیے قرآن حفظ کرتا ہے
اور اسے پڑھ پڑھ کر اپنی زبان صاف کرتا ہے
پھر تو دنیا کی نعمتوں میں اپنا دماغ کھپاتا ہے
تیرا دل ایک قاصد کی طرح مارا مارا پھرتا ہے

بلھا نے برگد کا بیج بویا تھا
جو ایک بڑے درخت کی مانند پھیل گیا
جب یہ درخت فنا ہو گیا
تو پھر پیچھے صرف وہی بیج باقی رہ گیا

کتابیات

انگریزی

۱۔ آربیری اے، جے، صوفی ازم، لنڈن ۱۹۶۹ء (طبع پنجم)

۲۔ بھٹاچاریہ، ہری داس (ایڈیشن) دی کلچرل ہیریٹیج آف انڈیا، جلد چہارم

۳۔ ڈیوس، ایف ہیڈلینڈ۔ دی پرشین مسٹکس۔ وزڈم آف دی ایسٹ سیریز لنڈن ۱۹۳۷ء

۴۔ گب اینڈ کرامرز، شورٹر انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، لیڈن، ۱۹۵۳ء

۵۔ ہیسٹنگز جیمز، انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس، ایڈنبرگ ۱۹۵۲ء (طبع دوم)

۶۔ ہیگس، ٹی، پی۔ ڈکشنری آف اسلام دہلی ۱۹۷۳ء

۷۔ کوہلی۔ ایس، ایس۔ اے کریٹیکل اسٹڈی آف دی آدی گرنتھ، دہلی ۱۹۷۶ء (طبع دوم)

۸۔ آؤٹ لائنز آف سکھ تھوٹ، نئی دہلی ۱۹۷۸ء (دوسرا ایڈیشن)

۹۔ لطیف، سید محمد۔ اے ہسٹری آف دی پنجاب، کلکتہ ۱۸۹۱ء

۱۰۔ مہادیون، ٹی، ایم، پی، آؤٹ لائنز آف ہندوازم، بمبئی ۱۹۵۶ء

۱۱۔ موہن سنگھ، ہسٹری آف پنجابی لٹریچر، امرتسر ۱۹۵۸ء

۱۲۔ مجیب، ایم۔ دی انڈین مسلم، لنڈن ۱۹۶۷ء

۱۳۔ مکرجی، رادھا کمل، تھیوری اینڈ آرٹ آف مسٹی سی ازم، نیویارک ۱۹۶۰ء

۱۴۔ راماکرشنا، لاجونتی، پنجابی صوفی پوائٹس (۱۴۶۰ء۔۱۹۰۰ء) لنڈن ۱۹۳۸ء

۱۵۔ شاردا، ایس۔ آر۔ صوفی تھوٹ، نئی دہلی ۱۹۷۴ء

۱۶۔ سبحان، جون، اے۔ صوفی ازم، اٹس سینٹس اینڈ شرائنز، لکھنؤ ۱۹۶۰ء

۱۷۔ تاراچند، انفلوانس آف اسلام آون انڈین کلچر، الہ آباد ۱۹۳۶ء
۱۸۔ تیجا سنگھ اینڈ گنڈا سنگھ، اے شورٹ ہسٹری آف دی سکھز، جلد اول (۱۴۶۹ء - ۱۷۶۵ء) بمبئی ۱۹۵۰ء
۱۹۔ ٹری منگھم جے اسپینسر۔ دی صوفی آرڈرز ان اسلام، آکسفورڈ ۱۹۷۱ء

پنجابی

۱۔ آزاد، کلدیپ سنگھ، بلھے شاہ دا صوفی اَن بھو ۱۹۶۹ء
۲۔ بھاشا وبھاگ، پنجاب۔ بلھے شاہ جیون تے رچنا، پٹیالہ ۱۹۷۰ء
پنجابی ساہتیہ دا اتہاس (مدھ کال) ۱۹۶۳ء
۳۔ دیوان سنگھ اینڈ گھمن، بکرم سنگھ، بلھے شاہ دا کاوِ لوک، جالندھر ۱۹۷۶ء
۴۔ فقیر محمد فقیر۔ کلیات بلھے شاہ، لاہور ۱۹۶۰ء
۵۔ گورودیو سنگھ۔ کلام بلھے شاہ، لدھیانہ، ۱۹۷۰ء
۶۔ اندرجیت کور۔ بلھے شاہ دیاں کافیاں۔ اک ادھئین، ۱۹۷۱ء
۷۔ کوہلی، ایس۔ ایس، پنجابی ساہتیہ دا اِتہاس، لدھیانہ ۱۹۵۵ء
۸۔ چونویاں کافیاں، پٹیالہ ۱۹۶۵ء
۹۔ بلھے شاہ رچناولی، پٹیالہ ۱۹۸۳ء
۱۰۔ موہن سنگھ۔ بلھے شاہ، ۵۰ کافیاں، لاہور ۱۹۳۰ء
۱۱۔ نرولہ، سندر سنگھ، بلھے شاہ امرتسر این۔ ڈی
۱۲۔ پدم۔ پیارا سنگھ۔ سائیں بلھے شاہ، پٹیالہ ۱۹۷۳ء (طبع دوم)
۱۳۔ ستیل، جیت سنگھ۔ بلھے شاہ۔ جیون تے رچنا۔ پٹیالہ ۱۹۷۰ء
۱۴۔ شاردا۔ ایس آر، صوفی مت اتے پنجابی صوفی ساہتیہ، پٹیالہ ۱۹۷۳ء
۱۵۔ شرما۔ جی۔ ایل۔ بلھے شاہ۔ ووہچن تے رچنا ۱۹۷۷ء

بلھے شاہ (۱٦٨٠ء تا ۱۷۵۸ء) کا شمار پنجابی کے عظیم ترین صوفی شاعروں میں ہوتا ہے اگرچہ انھوں نے بہت سے دوہرے، بارہ ماہے، اٹھواڑے اور دوہے لکھے ہیں لیکن یہ ان کی کافیاں ہیں جن کی بدولت انھوں نے ہندوستانی ادب کی تاریخ میں اپنا ایک مستقل اور نمایاں مقام بنایا وہ روحانی عشق کی حامل ان کی کافیاں ہیں جو نہایت دردوسوز کے ساتھ روحانی عشق کی مختلف کیفیات کو پیش کرتی ہیں۔ انھوں نے اپنے اشعار میں ایک خاص شدت اور ڈرامائی خصوصیت کے ساتھ انسانی روح کو ایک ایسی فراق کی ماری عورت کے طور پر پیش کیا ہے جو خدا سے وصال کے لیے بیتاب ہے لیکن اس دبستان کے دوسرے شعراء کے برعکس انھوں نے روایتی علامتوں اور ہیئتوں کا استعمال نہیں کیا۔

اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ ان کے نغمات پر بدھ مت، تو ہندویئت اور سکھ دھرم کے اثرات موجود ہیں، ایک منفرد شاعر کی حیثیت سے ان کی خصوصیت ہے کہ ان کے انتقال کے دوسو برس بعد بھی پنجابی شاعری کا عام قاری انھیں بڑی محبت اور عقیدت سے پڑھتا ہے۔

اس کتاب کے مصنف پروفیسر سریندر سنگھ کوہلی (پیدائش ۱۹۲۰ء) ہیں جو مدتوں پنجاب یونی ورسٹی (چنڈی گڑھ) کے شعبۂ پنجابی سے منسلک تھے۔ پروفیسر کوہلی ۷۰ سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ زیرِ نظر کتاب میں پروفیسر کوہلی نے بلھے شاہ کی شاعری پر قابل قدر نقد و تبصرہ کیا ہے۔

پندرہ روپے